Registered No. L. 5340

شوال ۱۳۶۸ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ:

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	(زیر طبع)	ہیگل مارکس اور نظام اسلام	(زیر طبع)
رسالہ دینیات	۱/۸/-	رسالہ دینیات (انگریزی) نیا ایڈیشن	۳/۸/-
حقوق الزوجین	۱/۸/-	اسلام کیا ہے (انگریزی) نیا ایڈیشن	۱/۸/-
مسئلہ قومیت	۱/۸/-	الحاد کے بعد کیا (")	-/۱۲/-
مسئلہ جبر و قدر	۱/-/-	سلامتی کا راستہ	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-/-	اسلام کا نظریہ سیاسی	-/۸/-
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-/-	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	-/۸/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴/-	انسان کا معاشی مسئلہ	-/۸/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴/-	اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/-/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا ائندہ لائحہ عمل	-/۸/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	دین حق	-/۶/-
پردہ	۲/۸/-	اسلام اور جاہلیت	-/۶/-
تنقیحات	۲/۸/-	ایک اہم استفتا	-/۳/-
خطبات نیا ایڈیشن	(زیر طبع)	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
تفہیمات	۳/۸/-	روداد جماعت اسلامی حصہ	۱/-/-
حقیقت توحید	۱/۲/-	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
اسلام اور ضبط ولادت	۱/-/-	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	(زیر طبع)
مسئلہ سود (زیر طبع)	۳/۸/-	روداد اجتماع خواتین	(زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

ذیلدار پارک اچھرہ - لاہور (پاکستان)

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

جلد ۳۲	ماہ شوال ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۴۹ء	عدد ۶

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس اچھرہ لین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(۴)

انتخابات کی ڈکشنری میں کامیابی کا لفظ عام طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ کسی جماعت کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے امیدوار کتنی تعداد میں انتخاب کی بازی جیت گئے۔ لیکن جماعت اسلامی کی ڈکشنری میں لفظِ کامیابی کا مفہوم دوسرا ہے۔ جو جماعت اقامتِ دین کا کام کرنے اٹھی ہو، اس کی مساعی کا اس حد تک نتیجہ خیز ہونا کہ عملاً مطلوبہ تبدیلیاں واقع ہو جائیں اور دینِ حق کو پورا پورا غلبہ حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے۔ لیکن جماعت کی اصل ذمہ داری دعوت کو بندگانِ خدا تک پہنچا دینے اور اصولِ اسلام کے برحق اور مفید ترین ہونے کی قولی و عملی شہادت دینے پر ختم ہو جاتی ہے۔ شہادتِ حق کے اس فرض کو صحیح معنوں میں ادا کرنے کے تقاضے اگر کسی جماعت نے پورے کر دیئے ہوں تو اس نے بازی مار لی اور جس نے اس میں کوئی کوتاہی دکھائی اس نے کھیل ہر دیا۔ اسلام کی علمبرداری کی سعادت دنیا میں جس فرد اور جس جماعت کو بھی حاصل ہوئی ہے اس کے سامنے کامیابی و ناکامی کا یہی نقطۂ نظر رہا ہے اور اسی نقطۂ نظر کو لے کر ہم لوگ جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری پوری کوشش آئندہ انتخابات میں یقیناً یہی ہوگی کہ ہم ملک و ملت کو غیر صالح قیادت سے نجات دلا کر ایک نئی صالح قیادت کو بروئے کار لائیں، لیکن اس کوشش میں ہمارے نزدیک اصل کامیابی یہ ہے کہ ہم اسلام کے انتخابات کے اصولوں کا عملی مظاہرہ کرنے میں کوئی کوتاہی نہ دکھائیں۔ اللہ نے اگر شہادت حق کے فرض کو ادا کرنے کی توفیق ہمیں دی تو پھر ہمارے لئے ناکامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — چاہے جماعتِ اسلامی کا ایک فرد بھی اسمبلی کی نشست حاصل نہ کر سکے۔

جماعت اسلامی کے سامنے سوال عہدوں کی کرسیوں کا نہیں، چند شخصیتوں کو ابھارنے اور چند دوسری شخصیتوں کو شکست دینے کا نہیں، کسی گروہ کو کسی گروہ سے ٹکرانے کا نہیں، بلکہ اس کا منتہا صرف اسلام کے اصولوں کی حقانیت و صداقت اور ان کی افادیت کا پورا پورا ثبوت قوم اور دنیا کے سامنے فراہم کر دینا ہے — یہاں تک کہ خدا کے بندوں پر اس دینِ حق کی حجت پوری ہو جائے۔

اس سے پہلے جب کوئی اہم مرحلہ ملک وملت کو پیش آیا ہے تو اس میں جماعت اسلامی نے شہادتِ حق کا یہی فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جماعت کے اوائلی دور میں جب وطنی قومیت کی تحریک مسلمانوں کو نگل لینے کے لئے سرگرمِ عمل تھی اور خود مسلمانوں کے بہت سے لیڈر اور کارکن اپنی خدمات اس تحریک کے لئے وقف کیے ہوئے تھے تو اس نازک لمحے میں جماعتِ اسلامی نے ملت کے سینے میں اس فریضۂ اقامتِ دین کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جو طبعی طور پر ملت سے اپنے جداگانہ وجود کو برقرار رکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر جب وطنی تحریک کے گرداب سے ملت کا سفینہ نکل آیا اور مسلمان جداگانہ طور پر تحریکِ پاکستان کے لئے منظم ہو کر سرگرمِ عمل ہونے لگے تو جماعت اسلامی نے ان کو مسلسل یہ دعوت دی کہ وہ اپنی تحریک کو خالص اسلامی طرز پر نشوونما دیں، اور صرف دعوت ہی نہ دی بلکہ اسلامی نظمِ جماعت، اسلامی طریقِ کار، اسلامی شورائیت اور اسلامی معیارِ قیادت کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ اس کوشش کے نتیجے میں اگرچہ تحریکِ پاکستان کا رُخ نہ بدل سکا اور اس کا اثر صرف بعض مخلص اور اسلام پسند افراد ہی تک محدود رہا، لیکن جماعت کی دعوت اور اس کا مظاہرہ اس لحاظ سے پوری طرح کامیاب رہا کہ اس کے حق ہونے کو تسلیم کرتے ہوئے لوگوں نے "اگر مگر" کے دروازوں سے فرار کرنے کی کوشش کی۔ کہنے والوں نے صرف یہ کہا کہ جماعت اسلامی بات تو ٹھیک کہتی ہے لیکن اس طریقِ کار میں دیر لگے گی، لہٰذا پہلے پاکستان بن جائے، پھر اسلام کے تقاضے پورے ہوتے رہیں گے۔

پھر جب نواکھالی، شمالی پنجاب اور صوبہ بہار میں فسادات کا طوفان اٹھا تو جماعت اسلامی اسلام کی طرف سے احترامِ انسانیت، قیامِ امن، اعانتِ مظلوم، مدافعتِ ظلم اور بحالیٔ اخلاق کے پیغام لے کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے کارکنوں نے جہاں ایک طرف بساط بھر مسلمانوں کو منظم کرنے، ان کے حوصلے (MORALE) کو بحال کرنے اور ان کو مختلف طریقوں سے امداد بہم پہنچانے کی کوشش کی وہاں دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اور غیر مسلموں کو بھی باہمی قتل و مقاتلہ، بچوں اور بوڑھوں پر دراز دستی اور عورتوں پر زیادتی کرنے سے باز رکھنے کے لئے ان کے شریفانہ جذبات سے اپیل بھی کی۔

پھر اسی طرح جب صوبۂ سرحد کے باشندوں سے پاکستان اور انڈین یونین میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہونے کے بارے میں استصواب کیا گیا تو جماعت اسلامی کے کارکنوں نے اپنی آرا پاکستان کے حق میں دیں اور دوسروں کو بھی یہی رہنمائی دی۔

پھر جب تقسیم ملک واقع ہوگئی اور خستہ حال مہاجرین پاکستان آنا شروع ہوئے تو جماعت اسلامی کے کارکنوں نے اپنے لئے سہولتیں حاصل کرنے کی جدوجہد میں محو ہو جانے کے بجائے لاہور کے مضافات میں باؤلی کمپ' والٹن کیمپ اور شاہدرہ کیمپ میں، اور اس کے علاوہ سندھ اور پنجاب کے بعض دوسرے کیمپوں میں مہاجرین کی مختلف خدمات انجام دے کر اس امر کا مظاہرہ کیا کہ اسلام مسلمانوں سے مہاجر مسلمانوں کے لئے کس قسم کی انصاریت کا مطالبہ کرتا ہے۔

علیٰ ہذالقیاس جب پاکستان بننے کے بعد یہاں ایک دستور کی تدوین کے لئے مجلسِ دستور ساز قائم ہوئی اور قوم کے سامنے یہ سوال آگیا کہ وہ اپنی آزاد زندگی کی تعمیر مغربی جمہوریت یا اشتراکیت کے اصولوں پر کرے یا اسلام کے پاکیزہ اصولوں پر، تو اس مرحلے پر جماعت اسلامی اس سوال کا صحیح جواب لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اسے شہر شہر، قریہ قریہ ایک ایک مسلمان تک پہنچایا۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں "مطالبہ نظامِ اسلامی" نمودار ہوا جس کے لئے جماعت اسلامی نے اتنی منظم تحریک بپا کی کہ دستور ساز اسمبلی نے ۱۲ مارچ ۴۹ء کو اس مطالبہ کو دستوری حیثیت سے تسلیم کر کے وہ "قراردادِ مقاصد" پاس کر دی کہ جس کے ہوتے ہوئے کسی غیر اسلامی دستور و نظام کو جاری کرنے کے دستوری راستے بہر حال بند ہیں۔

پھر اس قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کے بعد جب جماعت اسلامی نے یہ محسوس کیا کہ اس قراردادِ کے تقاضوں کے مطابق ملت جن تبدیلیوں کے ظہور کی آرزومند ہے ان کے واقع ہونے میں بدقسمتی سے اربابِ اقتدار کا وہ گروہ حائل ہے جو اپنے ذہن و سیرت کی مخصوص ساخت کی وجہ سے یہ اہلیت نہیں رکھتا کہ اسلامی نظام کی امامت کا فرض ادا کر سکے تو جماعت نے پورے دلائل کے ساتھ انقلابِ قیادت کی دعوت کو اپنے عوام تک پہنچانے کا آغاز کر دیا۔ اب اس انقلاب قیادت کو اسلام کے منشا کے مطابق برپا کرنے کے لئے رائے عام کو اسلامی اصولوں کی تربیت دینے کا جو مرحلہ سامنے آگیا ہے، اس میں جماعت اسلامی قول و عمل سے شہادتِ حق کا فریضہ انجام دینے اٹھی ہے۔ پس اس کام میں کامیابی کے اصل معنی صرف یہ ہیں کہ جماعت اسلامی نے شہادتِ حق کا حق ادا کر دیا۔ رہا یہ سوال کہ حالات کے دھارے کا رُخ عملاً کس حد تک مڑ سکیگا، یہ اللہ تعالےٰ کے اپنے اختیار میں ہے۔

کامیابی کا یہ تصور پیشِ نظر رکھنے کے معنی یہ نہ سمجھے جائیں کہ ہم لوگ ذرائع و وسائل، احوال وظروف اور تاریخی عوامل کو ناپ تول کر کام کی اسکیم مرتب کئے بغیر آنکھیں بند کر کے آگے بڑھ رہے ہیں۔ احوال کی سازگاری وناسازگاری کے جملہ پہلو ہمارے سامنے ہیں اور ان کا پورا پورا اندازہ کرنے کی ہم نے کوشش کی ہے اور اس کے بعد ہی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جہاں تک مشکلات کا تعلق ہے تلخ حقائق کے یہ پہلو ہمارے سامنے ہیں:-

۱۔ ہمارے سروں پر ایک پارٹی کی اجارہ دارانہ حکومت قائم ہے جس کا بس چلے تو وہ کسی دوسری پارٹی کے وجود ہی کو گوارا کرنے پر تیار نہیں ہے۔

۲۔ ہمارے ملک کے اکابر اور بعض غیر ذمہ دار عہدے دار اور بیشمار ماتحت ملازمین بر سرِ عام بھی اور پرائیویٹ صحبتوں میں بھی، کبھی کھلے کھلے اشارات کر کے اور کبھی نام لے کر ایک پارٹی کی حمایت اور دوسری پارٹیوں کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آنے والے انتخابات پر ان طریقوں سے بہت اثر ڈالا جا سکتا ہے۔

۳۔ انتخابات کیلئے جس آزادانہ فضا کی ضرورت ہوتی ہے، اسکو مکدر کرنے کے لئے اکابر نے پبلک سیفٹی ایکٹ اور پاکستان سیفٹی آرڈی ننس جیسے تسلطائی قوانین نافذ کر رکھے ہیں۔

۴۔ بعض دوسری سیاسی جماعتوں کے چند کارکنوں کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کے امیر، نائب امیر اور قیم آج حکومت کی نظر بندی میں ہیں اور ان کو نظر بند رکھنے کی وجوہِ جواز مہیا کرنے کیلئے آئے دن پروپگنڈے کے جو ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں، ان کی وجہ سے عوام غلط فہمیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایک جماعت کو معتوب سمجھکر اس سے تعاون کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔

۵۔ ہمارے عوام میں سیاسی شعور کی کمی ہے اور اس کمزوری سے مفاد پرست لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے پر ابھی تک قادر ہیں۔ علاوہ بریں کسی حد تک جمود اور پست ہمتی بھی موجود ہے۔

۶۔ مفاد پرستوں کے جال ابھی تک ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے حلقوں کو کاٹنا کوئی ایسا آسان کام نہیں جو دنوں میں ہو جائے۔

ان مشکلات کے بالمقابل حالات کے دوسرے پلڑے میں جن روشن پہلوؤں کو رکھ کے وزن کرنا چاہیئے وہ یہ ہیں:-

۱۔ ہمارے موجودہ لیڈروں نے گذشتہ دو سال کے کارناموں سے رائے عام کو انقلاب قیادت کی ضرورت کا احساس

خود دلایا ہے اور ہر طرف نئی صالح قیادت کی پیاس پیدا ہو چکی ہے۔

۲- یہ بات بھی شہری اور دیہاتی ہر حلقے میں محسوس کی جا رہی ہے کہ موجودہ کار فرما طاقتوں کے ہاتھوں اسلامی نظام کبھی بھی برسر عمل نہیں آسکتا۔

۳- عوام کو اگرچہ اسلام کا واضح شعور نہیں ہے اور انکی دلچسپیاں بیشتر جذباتی ہیں، لیکن وہ بہرحال انتخابات کے متعلق اسلام کی رہنمائی کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں اور ان میں سیاسی شعور دین ہی کے ذریعے جلد رونما ہو سکتا ہے۔

۴- جماعت اسلامی کے متعلق بار بار غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود ملّتِ پاکستان کو اس بات کا شعور بہرحال ہو چکا ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کی منظم جدوجہد کرنے والی واحد جماعت یہی ہے اور اسمیں یہ بل بوتا ہے کہ پاکستان کو مغربی جمہوریت اور کمیونزم کے تسلط سے بچالے۔

۵- جماعت کے جلسوں میں شرکت، اس کے پیغام پر توجہ اور انتخابات کے متعلق اسلامی اصولوں کی دعوت سے تاثر کا جو ثبوت گذشتہ دو ماہ سے عوام ملک نے دیا ہے، وہ بہت ہی حوصلہ افزا ہے۔

۶- جماعت اسلامی کے علاوہ بہت سی دوسری دینی جماعتیں بھی صالح قیادت کو بر روئے کار لانے کا عزم رکھتی ہیں۔

یہ ہیں حالات کے روشن اور تاریک پہلو جنکا میزانیہ سامنے رکھکر ہی جماعت نے انتخابات میں شرکت کا فیصلہ کیا ہے۔ اب آگے مسئلہ جدوجہد کا ہے اور جتنی جدوجہد ہوگی، اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بھی اتنے ہی نتائج دکھائے گا۔

نتائج کے لحاظ سے تین صورتیں پیش آسکتی ہیں اور ان میں سے کسی ایک میں بھی ناکامی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

پہلی صورت یہ ہو سکتی ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے ہم اسکی توقع کرتے ہیں کہ قیادت میں ایک موثر تبدیلی رونما ہو جائے اور اسمبلیوں میں کسی طرح اسلام سے گہری وابستگی رکھنے والے صالحین کی ایک بڑی تعداد جمع ہو جائے۔ یہ صورت اگر پیدا ہو گئی تو اسلامی دستور بنانے اور جماعت کے زیر ترتیب منشور کی خاص الخاص کے مطابق حکومت کے نظم و نسق اور معاشرتی حالات اور معاشی نظام میں فوری اور تدریجی تبدیلیاں عملاً رونما کرنے کا کام جلد از جلد آغاز پذیر ہو سکے گا۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ صالحین کی ایک قلیل تعداد ہی کو آگے لایا جا سکے۔ اس صورت میں یہ قلیل تعداد بھی جب ایک اصولی مقصد کیلئے کام کرنا چاہیگی تو یہ بعض ایسے لوگوں کو بھی ساتھ لے سکیگی جو پہلے اسلام کی حمایت میں سرگرمی سے

کام کرنے کی جرأت نہیں دکھا رہے تھے لیکن اب ایک طاقت کو کام کرتے دیکھ کر انکی ہمت بندھ جائیگی۔ علاوہ بریں مختلف مسائل میں قدم قدم پر جب اسلام پسند عنصر اور مغربیت مآب عنصر میں کشمکش ہوگی تو مختلف لوگ مختلف مسائل میں اسلام پسند عنصر سے تعاون کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔

لیکن ہم اس سے بھی گر کر تھوڑی دیر کیلئے یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ صالحین کی اتنی تعداد بھی آگے نہ آسکے گی کہ وہ کوئی حزبِ اختلاف (APPOSITION PARTY) مرتب کرسکے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس معیار کا صرف ایک ہی فرد سامنے آتا ہے جسے جماعت اسلامی نے کھڑا کیا ہے۔

ہم توقع کرتے ہیں کہ ایسا ایک فرد تن تنہا بھی بہت کچھ کرسکتا ہے۔ ایسا ایک شخص بھی اگر دین کے شعور اور نظام اسلامی کے قیام کے جذبے کے ساتھ اسمبلی کی کارروائیوں میں حصہ لے تو قدم قدم پر وہ پوری اسمبلی کے سامنے خدا و رسول کے صریح احکام کو سامنے رکھکر یہ سوال پیدا کرسکتا ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ نبوی کو مانتے ہو یا پامال کرکے آگے بڑھنا چاہتے ہو؟ اسمبلی ہال میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اگر کوئی ایک شخص بھی پوری جسارت سے انجام دینے پر کمربستہ ہو تو اسکا یہ فائدہ بھی ہوسکتا ہے کہ نمائندگانِ ملت کیلئے قانونِ الٰہی سے صریح انحراف کرنا ممکن نہ رہے۔ لیکن اگر یہ فائدہ بھی ہو تو کم سے کم رائے عام کی تربیت کرنے میں بہت بڑی مدد اس طریق سے بہم پہنچ سکتی ہے۔

تیسری صورت جو محض بطور ایک مفروضے کے ہم سامنے رکھنا چاہتے ہیں، یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی ایک صالح آدمی بھی ادھر نہ آیا جاسکے۔ شاید دنیوی سیاست کی نگاہ میں یہ ایک کھلی کھلی ناکامی ہوگی لیکن جماعت اسلامی جس دینی سیاست پر کاربند ہے اس کے لحاظ سے اس صورت میں بھی کامیابی کے نمایاں پہلو موجود ہیں۔ جہاں تک اخروی کامیابی کا تعلق ہے ——— اور جو ہمارے نزدیک اصل مطلوب و مقصود ہے ——— وہ صحیح طور پر کام کرنے کے بعد ہر حال میں محفوظ ہے۔ لیکن سوال صرف اخروی کامیابی ہی کا نہیں۔ دنیوی طور پر بھی ناکامی کی کوئی وجہ نہیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابلِ لحاظ ہیں:۔

(۱) اس وقت تاریخ کا وہ لمحہ ہمیں درپیش ہے جسے تبدیلی کا لمحہ کہتے ہیں۔ لوگ جس سیاسی نظم میں منسلک تھے وہ اپنا نصب العین پورا کر چکنے کے بعد طبعی طور پر انحلال سے دوچار ہے اور تاریخ کے قوانین کے تحت خود اس کے اندر سے شکست و ریخت کے وجوہ و اسباب ابھر آئے ہیں۔ ایسے لمحے میں ملک کو ایک نئے مرکزِ تنظیم کی ضرورت ہے۔ لیکن اس وقت جماعت کے میدان میں آجانے سے یہ فائدہ بہرحال حاصل ہوگا کہ عوام کو انتشار سے بچکر ایک جگہ سمٹنے کیلئے نئے مرکز سے تعارف ہو جائے گا۔

(۲) کارکنانِ جماعت کو رابطۂ عوام کا جو موقع ملیگا، اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے نتائج کبھی ضائع نہیں ہو سکتے۔ بلکہ لازماً جماعت کی دعوت گاؤں گاؤں پھیل کے رہیگی اور کئی کروڑ باشندوں کو براہ راست جماعت کے کارکنوں کو دیکھنے اور ان کے مسلک کو سمجھنے کا موقع ملیگا، اور انکی بیشمار غلط فہمیاں اس رابطہ کی وجہ سے صاف ہو جائینگی۔ (۳) کارکنانِ جماعت کو آئندہ مراحل میں کام کرنے کیلئے اپنے آپ کو تربیت دینے کے بہترین مواقع حاصل ہونگے۔ (۴) ملک کے اصل صالح عناصر کے متعلق جماعت اسلامی کے کارکنوں کو تفصیلی طور پر یہ اندازہ ہو سکیگا کہ یہ کہاں کہاں پائے جاتے ہیں اور انکے ذریعے کتنا کام کسطرح کیا جا سکتا ہے (۵) دوسری طرف ملک کے مفسد عناصر سے بھی براہ راست واسطہ پڑیگا اور پورے ملک میں ایسے لوگوں کو پہچانا جا سکیگا جو قرار دادِ مقاصد کے تقاضوں کے پورا ہونے میں اپنی دولت، اپنے اثر و رسوخ اور اپنی دماغی قابلیتوں کے ذریعے مزاحم ہونیوالے ہیں۔

چاہے ہمارے معیار کا ایک صالح فرد بھی منتخب نہ ہو سکے ——— تو بھی ہم اس صورت میں سو فیصدی کامیاب ہونگے جبکہ ہم اسلام کے اصولِ انتخاب اور اسکے سیاسی اخلاق کا ایک صحیح نمونہ ملک کے سامنے رکھ دیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر لوگ حسبِ سابق اسلامی معیار سے گرے ہوئے لوگوں کو منتخب کریں اور پھر انکے ہاتھوں وہ بار بار تلخ تجربات کا سامنا کریں تو انکو زمانہ انتخاب کے یہ واقعات یاد آکے پشیمان کر سکیں کہ ہمیں ان غلط کار نمائندوں کے تسلط سے بچانے اور صالح قیادت کو روبکار کرنے کیلئے کچھ ایسے لوگ ہمارے سامنے آئے تھے جنہوں نے گالیاں نہیں بلکہ گالیوں کا جواب گالیوں سے نہیں دیا تھا، جن پر بہتان لگائے گئے لیکن انہوں نے جواب میں بہتان تراشیاں نہیں کی تھیں، جنکے خلاف جوڑ توڑ کیئے گئے لیکن انہوں نے کوئی سازشی کارروائی کرنے سے اپنا دامن پاک رکھا، جنکی جدوجہد ناکام کرنے کیلئے روپیہ استعمال کیا گیا لیکن جواب میں انہوں نے روپے کے ذریعہ حمایت خریدنے کی کوشش نہ کی۔ دوسروں نے برادریوں کی عصبیتوں کو بھڑکایا لیکن انہوں نے اخوتِ اسلامی کو چرکے لگانے کی زیادتی کبھی نہ کی۔ دوسروں نے غنڈہ ازم سے مدد لی لیکن انہوں نے اسلام کے معیارِ اخلاق سے گرنے کی ذلت گوارا نہ کی۔

اسطرح کا تقابلی احساس دلانے کیلئے جماعت اسلامی اگر اصحابِ فسق و فجور اور اربابِ صالحیت کی دو صفوں کو آمنے سامنے لانے میں کامیاب ہو گئی تو آئندہ چار پانچ سال فیصلہ کن نتائج بروئے عمل لاکے رہینگے ——— یہ واقعہ ابھی کل کا ہے کہ آخری انتخابات سے پہلے ہمارے ملک میں جو انتخابات ہوئے تھے انہیں پہلی مرتبہ مسلم لیگ میدان میں آئی تھی اور مغربی پنجاب جیسے متاثر صوبہ میں اسکے صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے تھے جنمیں سے ایک مسلم لیگ سے ٹوٹ گیا تھا اور کل ایک نمائندہ مسلم لیگ کیطرف سے اسمبلی میں کام کرنے کیلئے باقی رہ گیا تھا، لیکن دوسرے انتخابات میں وہی مسلم لیگ تھی کہ ہاؤس اسکے تسلط میں تھا۔

پس جماعت اسلامی ناکامی کا شمہ بھر اندیشہ بھی نہیں رکھتی، بلکہ وہ دیکھ رہی ہے کہ اس کیلئے کامیابی کی راہیں پوری طرح کھلی ہیں، اور وہ ساری مزاحمتوں کے باوجود اپنے اصولوں پر اور ان اصولوں کے خالق پر پورا پورا بھروسہ رکھکر میدانِ عمل میں قدم رکھ رہی ہے۔

لیکن جماعت کے کارکنوں کو اس بات کا پورا پورا احساس ہونا چاہیے کہ پیشِ نظر کام کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، بلکہ ایک ایسا معرکہ ہے جس کیلئے ۞

۞ ذہنی و اخلاقی کی بہت بڑی تیاریوں کی اور بالخصوص تعلق باللہ کی اشد ضرورت ہے۔ ان تیاریوں کا اہتمام کیئے بغیر طوفان میں کود پڑنا ایک مدہوش جسارت کے مظاہرے کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

قیادت کا اسلامی معیار

(مولینا عبدالغفار حسن صاحب)

دنیا سے فساد، بے چینی مٹانے اور امن و خوشحالی کی فضا پیدا کرنے کے لئے جس طرح صالح و عادل نظام ضروری ہے اسی طرح اُسے بروئے کار لانے کے لئے صالح قیادت بھی ناگزیر ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ غیر صالح قیادت کے ہاتھوں صالح نظام قائم ہو سکے۔ کیا چوروں اور ڈاکوؤں سے بھی کبھی امن قائم ہوا ہے؟ کیا کبھی بیماروں اور مُردوں کے ذریعہ بھی کسی نے صحت و زندگی پائی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت پاکستان کو قرارداد مقاصد کے ذریعہ صالح نظام کے قیام کا اعلان کئے ہوئے چھ ماہ گذر چکے ہیں لیکن ابھی تک یہاں کے باشندے اس کی ابتدائی برکتوں اور راحتوں سے بھی ہم کنار نہیں ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ جب قیادت کی مسند پر ایسے گروہ کا قبضہ ہو کہ جس کی اکثریت غیر صالح اور دین سے ناآشنا ہو تو اسے بدلے بغیر نظام حق قائم نہیں ہو سکتا۔

صالح قیادت کی اہمیت قرآن حکیم نے جہاں صالح نظام کے اصول و مبادی اور اہم تفصیلات بیان کی ہیں وہاں ساتھ ہی صالح قیادت کی اہمیت، اور اس کے اوصاف پر بھی جابجا روشنی ڈالی ہے۔ اس معاملے میں اس نے مسلمانوں کو صاف صاف ہدایت دی کہ:-

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ	بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو
اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ	ان کے مستحقین کے حوالے کر دو، اور جب تم لوگوں
اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ۔ (سورہ نساء آیت ۵۸)	کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اس آیت میں دو باتوں کا مطالبہ کیا گیا ہے (۱) امانتیں خصوصاً حکومت و اقتدار کی امانت اہل اور صالح افراد کو سونپی جائیں (۲) نظامِ عدل کے قیام کی کوشش کی جائے کیونکہ حکم بالعدل (انصاف کے ساتھ فیصلہ) اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ نظامِ عدل اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ قائم

و نافذ نہ ہو جائے۔

یہاں "امانات" سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کی دو رائیں ہیں:-

(۱) حکومت و اقتدار کی ذمہ داریاں۔

(۲) ہر وہ شے جس کی حفاظت و نگرانی کی ذمہ داری کسی نے قبول کر لی ہو

پہلی رائے زید بن اسلم، شہر بن حوشب اور مکحول تابعی اور حضرت ابی بن کعب سے منقول ہے (احکام القرآن ابن العربی ج ۱، ص ۴۵۱ و احکام القرآن جصاص ج ۲ ص ۲۵۲) خود قرآن حکیم کا سیاق بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ مثلاً ادائے امانت کے حکم کے بعد فرمایا۔ ان تحکموا بالعدل پھر اس کے بعد متصل آیات میں اطاعت، اولی الامر کا حکم اور طاغوت کے پاس فیصلے جانے کی مذمت کی گئی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت محولا بالا کا موضوع سیاسی ہے۔ اگر دوسری رائے بھی قبول کر لی جائے تب بھی دوسری امانتوں کے درمیان اقتدار کی امانت کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوگی۔

قاضی ابن العربی مالکی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس آیت میں ادائے امانت اور حکم بالعدل کا مطالبہ حکام اور عوام دونوں سے ہے اس لئے کہ ہر مسلم عالم ہے بلکہ اس لئے کہ ہر مسلم حاکم اور والی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

(۱) المقسطون یوم القیامۃ علی منابر من نور عن یمین الرحمٰن وکلتا یدیہ یمین، وھم الذین یعدلون فی حکمھم و اھلیھم وما ولوا۔ (بخاری۔ کتاب الاحکام)	انصاف پسند لوگ قیامت کے دن رحمٰن کے دائیں جانب نور کے منبروں پر ہوں گے (اور رحمٰن کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں) اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنی ذات، اپنے عیال اور جن کے وہ والی ہوتے ہیں ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں۔
(۲) کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ فالامام راع علی الناس وھو مسئول عنھم۔ الحدیث	تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی، پس امام لوگوں پر نگران ہے اور اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنے اپنے درجہ میں راعی اور حاکم ہے" (احکام القرآن ابن العربی ج ۱ ص ۴۵۱)
بہر حال اگر مذکورہ بالا آیت کا مفہوم عام بھی لیا جائے تب بھی "امانات" کی صف میں دولت و اقتدار کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کی تائید ذیل کی روایات سے ہوتی ہے جن میں اقتدار کو امانت سے تعبیر کیا گیا ہے:

(۱) اذا ضیعت الامانۃ فانتظر الساعۃ قیل وما اضاعتہا قال اذا وُسِّدَ الامرُ الی غیر اہلہ فانتظر الساعۃ۔ (صحیح بخاری، مشکوٰۃ باب اشراط الساعۃ ص ۴۶۹)	جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ لوگوں نے پوچھا اس کے ضائع کرنے کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا جب امر (حکومت و اقتدار) نااہلوں کے حوالے کر دیا جائے، تب قیامت کے منتظر رہو۔
(۲) عن ابی ذر قال قلت یا رسول اللہ الا تستعملنی فضرب بیدہ علی منکبی وقال یا ابا ذر انک ضعیف وانہا امانۃ وانہا یوم القیامۃ خزی وندامۃ الا من اخذہا بحقہا وادی الذی علیہ فیہا۔ (صحیح مسلم ج ۲ کتاب الامارۃ)	حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ کیا آپ مجھے (کسی صوبہ یا ضلع کا) عامل (حاکم) نہ بنا دیں گے؟ آپ نے فرمایا تم کمزور ہو اور حکومت ایک امانت ہے اور وہ قیامت کے روز رسوائی اور پشیمانی کا باعث ہوگی، ہاں مگر جس نے اُسے حق کے ساتھ لیا اور جو فرض اس پر عائد ہوتا ہے اُسے ادا کیا۔

ایک قابل غور اشارہ | مذکورۃ الصدر آیت میں صالح اور اہل قیادت کے برسرِ کار لانے کا مطالبہ پہلے کیا گیا ہے اور نظام عدل (حکم بالعدل) کے قیام کا مطالبہ بعد میں، اس انداز تعبیر سے صالح قیادت اور خدا ترس عمال حکومت کی جو اہمیت ظاہر ہوتی ہے وہ اہل علم حضرات سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ خلاصۂ مدعا یہ ہے کہ حکومت و اقتدار خدا و خلق کی ایک گرانبہا امانت ہے اور اسے صرف اہل لوگوں کے حوالے کرنا مسلمانوں کے لئے شرعاً لازم ٹھہرایا گیا ہے، بخلاف اس کے اگر کچھ لوگ اسے نااہل لوگوں کے حوالے کریں تو وہ عند اللہ گنہگار ہوں گے اور پھر جو نااہل ہوتے ہوئے اس امانت کو زبردستی اپنے قبضے میں لیں وہ اپنے اوپر، نظامِ سلطنت پر اور ملک و ملت پر ظلم توڑتے ہیں۔

قیادت کا غیر اسلامی معیار پہلے اس سے کہ اہل امانت کے اوصاف اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قیادت و رہنمائی کے جاہلی معیار کو بھی سامنے رکھدیا جائے۔ کسی شئے کی حقیقت اس کی ضد سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ وبضدھا تتبین الاشیاء۔

قرآن حکیم نے اس بارے میں کفار کا قول نقل کیا ہے۔

لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم۔ (پ ۲۵ سورہ زخرف آیت ۳۱)	یہ قرآن (مکہ اور طائف کی) دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟

یہاں عظیم سے مراد وہ شخص ہے جو خاندانی وجاہت، اثر و رسوخ مال و دولت کے انبار اور حکومت و اقتدار کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھتا ہو۔ باغوں، جاگیروں، نہروں اور چشموں کی اس کے پاس فراوانی ہو، شعبدہ بازی اور خارق عادت کمالات دکھانے میں طاق ہو۔

یہ سب تفصیلات پ ۱۵ سورہ بنی اسرائیل آیات ۹۰، ۹۱، ۹۲ میں موجود ہیں، یہاں بنظر اختصار ان کو نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ قرآن نے اس قول کفار کی کجی کو واضح کیا ہے، بلکہ اس کی تردید تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت خود کر ہی رہی تھی۔

قیادت کا اسلامی معیار قیادت کے اسلامی معیار کو معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انبیاء کرام کے ان احوال و اوصاف کا انتہائی غور و فکر سے مطالعہ کیا جائے جن کی تشریح قرآن مبین کے مختلف مقامات میں ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر نبی اپنی قوم کا قائد اور رہنما ہوتا ہے۔ آج بھی اگر ہم صالح قیادت کے خد و خال دیکھنا چاہتے ہیں تو انبیاء کرام اور ان کے مخلص اصحاب کی سیرت ہی کو معیار بنانا ہوگا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ (پ البقرہ آیت ۔)	اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو اس نے پوری کر دکھائیں، (تب) خدا نے فرمایا میں تجھے لوگوں کا امام و قائد بنانا ہوں، حضرت ابراہیم نے کہا اور میری اولاد میں سے (یعنی کیا میری نسل بھی قیادت و امامت کا منصب

پاسکیگی ؟) جواب ملا میرا یہ وعدہ ظالموں کیلئے نہیں ہے۔

اس آیت میں امامت وقیادت کے معیار کا ایجابی Positive پہلو بھی بتایا گیا ہے اور

سلبی Negative پہلو بھی!

(۱) اللہ تعالیٰ کے امتحان وآزمائش کے مواقع پر پورا اترنا، (۲) ظلم سے پرہیز۔ اولاً سلبی معیار پر قرآنی تشریحات پیش کی جاتی ہیں۔ بعد میں ایجابی معیار کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔

ظلم اور ظالم کے معنی | ظلم کیا ہے اور ظالم کون ہیں؟ اس کی تشریح بھی قرآن مبین کی مندرجہ ذیل آیات میں موجود ہے:۔

(۱) ان الشرك لظلم عظیم۔ — بلاشبہ شرک بڑا ظلم ہے۔

محض بت پرستی، کواکب پرستی اور قبر پرستی ہی شرک نہیں ہے بلکہ خدا کی صفت تشریع (قانون سازی) اور حاکمیت میں دوسروں کو ہم پلہ ماننا بھی شرک ہے۔ معابد کی محدود چار دیواری میں خدا کی عبادت، اور باہر کی تمام زندگی میں طاغوت کے قانون کی اتباع وترویج بھی شرک ہے۔

اس لئے وہ تمام قائدین جو سیاست اور نظام حکومت کو دائرہ مذہب سے الگ رکھنا چاہتے ہیں، منصب امامت وقیادت کے اہل نہیں ہو سکتے اور نہ اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کی امانت انکو سونپی جا سکتی ہے۔

(۲) وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (مائدہ پ آیت ۴۵) — اور جو کوئی اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے، تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں قانونِ الٰہی کی پروا نہیں کرتے ان کے ہاتھوں میں پیشوائی ورہنمائی کی باگ ڈور نہیں دی جا سکتی۔

(۳) ومن يتعد حدود الله فاولئك هم الظالمون۔ (سورہ بقرہ پ آیت ۲۲۹) — اور جو اللہ کی حدود کو پھاند جاتے ہیں تو یہی لوگ ظالم ہیں۔

جو لوگ حلال وحرام کی حدود توڑتے ہوں، شراب، رقص وسرود اور رشوت وسود میں مبتلا رہتے

ہوں یا ان کے اڈوں کی سرپرستی اور افتتاح فرماتے ہوں، انہیں کب یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ امت محمدیہ کی سربراہ کاری اور اسلامی حکومت کی پاسبانی کا دعوے کریں !

(۴) فمن افترا علی اللہ الکذب فاولئک ھم الظالمون۔ (پ ۴ آل عمران آیت ۹۴)

جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں تو وہ ظالم ہیں۔

کافرانہ تصورات اور تہذیب پر اسلام کا لیبل لگانا وہ فریب کارانہ ظلم ہے کہ اس کے مرتکب صفِ قیادت تو کجا صف نعال میں بھی جگہ نہیں پا سکتے۔

(۵) واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینہم اذا فریق منہم معرضون۔ وان یکن لہم الحق یأتوا الیہ مذعنین افی قلوبہم مرض ام ارتابوا ام یخافون ان یحیف اللہ علیہم ورسولہ بل اولٰئک ھم الظالمون۔ (پ ۱۸ سورہ النور آیت ۵۰)

اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف فیصلے کے لئے بلائے جاتے ہیں تو اچانک ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کا حق ہوتا ہے تو اس کی طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک میں پڑ گئے ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کریں گے بلکہ وہ خود ظالم ہیں۔

اسلام کا نام اوڑھ کر اس کے حقوق سے متمتع ہونے والے اور اس کے عائد کئے ہوئے فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے کترانے والے جہاں اپنا مفاد نظر آئے وہاں اسلام کے علمبردار اور جہاں ایثار و قربانی کا سوال سامنے ہو وہاں خشک کر رہ جانے والے کب اسلامی جہاز کے ناخدا بن سکتے ہیں۔

(۶) یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا آباءکم واخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان ومن یتولہم منکم فاولئک ھم الظالمون (سورہ توبہ پ ۱۰ آیت ۲۳)

اے ایمان والو! اپنے باپ دادوں اور اپنے بھائی بندوں کو دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کرتے ہیں اور جو تم میں سے ان سے دوستی رکھے گا تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

(۷) انما ینہاکم اللہ عن الذین قاتلوکم

صرف اللہ تم کو ان لوگوں سے روکتا ہے جنہوں

فی الدین واخرجوکم من دیارکم	نے دین کے بارے میں تم سے جنگ کی اور تم کو تمہارے
وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم و	گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے پر دوسروں کی
من یتولھم فاولئک ھم الظالمون۔	مدد کی کہ تم ان سے دوستی رکھو۔ اور جو ان سے دوستی
(سورہ ممتحنہ پ ۲۸ آیت ۹)	رکھیں گے وہ ظالم ہیں۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ اسلام دشمن عناصر سے ساز باز رکھنے والے ان کی تقلید اور نقالی کرنے والے، ان کے فلسفوں، نظریوں اور طور طریقوں کو پسند کرنے والے، ان کو ذہنی و تہذیبی و سیاسی پیشوا ماننے والے کبھی بھی ملت اسلامیہ کے اعتماد کے قابل نہیں ہو سکتے۔

(۸) قال معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای	یوسف علیہ السلام نے فرمایا خدا کی پناہ بے شک
انہ لا یفلح الظالمون۔	وہ میرا رب ہے جس نے مجھے اچھا ٹھکانا بخشا۔ حقیقت
(پ ۱۲ سورہ یوسف آیت ۲۳)	یہ ہے کہ ظالم فلاح نہیں پا سکتے

یوسف علیہ السلام کے اس قول میں موقع کلام کے لحاظ سے بدکاروں اور عیش و نشاط کے بندوں کو ظالم ٹھہرایا گیا ہے۔ ان کے لئے فلاح کے دروازے بند ہیں۔

(۹) قال معاذ اللہ ان ناخذ الا من	یوسف علیہ السلام نے فرمایا خدا کی پناہ اس سے کہ
وجدنا متاعنا عندہ انا اذاً لظالمون	ہم کسی دوسرے شخص کو پکڑیں۔ اس کے سوا جس کے پاس ہم نے
(پ ۱۳ سورہ یوسف آیت ۷۹)	اپنا مال پایا ہے۔ تب تو ہم بلاشبہ ظالم ہوں گے۔

جو قیادت مجرموں کو چھوڑ کر بے گناہوں کی آزادی سلب کرے، زانیوں اور شرابیوں کو معاف کر دے اور دعوت حق کے حامیوں اور اقامت دین کے علمبرداروں کو قید و بند کی سزا دے وہ قرآن کی زبان میں ظالم ہے اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کے بندوں کی گردنوں پر مسلط رہے۔

(۱۰) یا ایھا الذین آمنوا لا یسخر قوم	اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے
من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرا منھم	اور نہ عورتیں ایک دوسرے پر ہنسیں۔ ہو سکتا ہے
ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا	کہ جن پر ہنسا جا رہا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔

منهن ولا تلمزوا انفسكم ولا تنابزوا بالالقاب، بئس الاسم الفسوق بعد الايمان ومن لم يتب فاولئك هم الظالمون (پ ۲۶ الحجرات)

اپنی جانوں کو عیب نہ لگاؤ اور آپس میں ایک دوسرے کو نام نہ دھرو ایمان کے بعد فسق کیا ہی برا نام ہے اور جس نے توبہ نہ کی تو یہی لوگ ظالم ہیں۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ ایک دوسرے کی ہنسی اڑانے والے، اپنے سے کمتر انسانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے والے اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو جانے والے امارت و پیشوائی کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اسی مفہوم کو دوسری جگہ یوں ادا کیا گیا ہے۔

تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين۔

وہ دار آخرت (اور وہاں کی نعمتیں) ان کے لئے ہیں جو زمین میں بلندی اور فساد نہیں چاہتے اور عاقبت متقیوں کے لئے ہے۔

(پ ۲۰ سورہ قصص آیت ۸۳)

ان دس آیات میں جن اوصاف کا بیان ہے یہ دراصل فاسقانہ اور غیر اسلامی قیادت کے خدوخال ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو جو لوگ اپنی رہنمائی اور سربراہ کاری کے لئے منتخب کرتے ہیں وہ نہ صرف اپنے ہی آپ کو بلکہ پورے ملک و ملت کو ظلم و عدوان کی دوزخ میں جھونک دیتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

معاشی ناہمواریوں کا اسلامی علاج

قسط سوم

نعیم صدیقی

اسرافیات کا سدِباب اسلام وہ دین ہے جس میں وضو اور غسل کے لئے ضرورت سے زیادہ پانی بہا دینا بھی عند اللہ قابلِ مواخذہ جرم ہے، کجا کہ عیش و عشرت کے ہنگاموں اور لہو و لعب میں اللہ کے خزانے سے رزق کو جھونکا جائے۔ پھر یہ وہ دین ہے جس نے مسرفین کو شیطان کی برادری میں شامل کیا ہے۔ پس اگر پاکستان میں اسلامی نظام نافذ العمل ہوگا تو اسراف کا سدِباب کرنے کے لئے اسے لازماً مختلف قانونی اور اخلاقی تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔ سوسائٹی میں اسراف کے حسبِ ذیل اثرات نمایاں ہیں:-

(۱) دولتِ عامہ کا ایک کثیر حصہ امیر لوگ اور ان کی دیکھا دیکھی متوسط طبقے کے لوگ ضروریاتِ زندگی کے بالاتر تعیشات میں کھپا دیتے ہیں۔ نتیجۃً سوسائٹی کے عوام کی محرومی بڑھ جاتی ہے۔

(۲) مسرفانہ معیارِ زندگی کے مصارف پورے کرنے کے لئے عوام کی جیبوں سے روپیہ نکالنے کی غیر اسلامی صورتیں اختیار کی جاتی ہیں، جن کی وجہ سے پورا معاشرہ بگڑ جاتا ہے اور لازماً ناہمواریاں بڑھتی ہیں۔

(۳) سوسائٹی کے بے شمار مرد و عورتیں عامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اعلیٰ اور پاکیزہ خدمات انجام دینے کے بجائے رقص و سرود اور امراء کی تفریح کے دوسرے لوازم کے اہتمام میں کھپ جاتے ہیں اور پیداآور صنعتوں اور علم و اخلاق کی ترقی کی رفتار کمزور ہو جاتی ہے۔

(۴) اسراف کی چھوت امراء سے متوسط طبقے میں اور متوسط طبقے سے غریب عوام میں پھیلتی ہے اور اس طرح ایک عام اخلاقی انحطاط اس کے ساتھ ساتھ پھیلتا جاتا ہے۔

اسلامی شریعت نے اسرافیات کی روک تھام کے لئے جن چیزوں پر صریح قانونی بندشیں لگادی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کے استعمال کو جرم قابل مواخذہ ٹھہرایا ہے، دوسرے یہ ہے کہ سونے کے زیورات اور ریشم کے ملبوسات کو مردوں کے لئے قطعی حرام کردیا ہے، تیسرے یہ ہے کہ چاندی سونے کے برتنوں اور عورتوں کے زیورات کے سوا دوسرے آرائشی سامانوں کو ممنوع قرار دیا ہے، چوتھے حرمت تصاویر کی وجہ سے آرٹ گیلریاں جانے اور رنگ روم کو مجسموں سے آراستہ کرنے کا دروازہ بند کردیا ہے، پانچویں پیشہ ور گویوں اور آلاتِ موسیقی کے وجود کو مسلم سوسائٹی کے لئے ناقابلِ برداشت قرار دیا ہے، چھٹے رقص اور بے حیائی کی دوسری صورتوں، نیز اور شکی جنسی قسم کے تفریح آمیز کھیلوں کو مستثنیٰ کر کے لہو ولعب اور تضیع اوقات کو جائز نہیں رکھا، ساتویں قمار آمیز تفریحات کو حرام ٹھہرایا ہے، آٹھویں زندگی کی تقریبات میں ضیاع مال کو روکنے کے لئے ان کو سادگی کی حدود کا پابند کردیا ہے، نویں بلا شدید ضرورت کے کتے پالنے کی اجازت نہیں دی، دسویں مکانوں کو نقش ونگار سے مزین کرنے اور قبروں کو چونے گچ بنوانے کو سخت مکروہ شمار کیا ہے، گیارہویں لباس میں کبر کے اور عام معاشرت میں ٹھاٹ کے مظاہرے کو بھی حرام کردیا ہے۔

یہ ایسے طے شدہ امور ہیں کہ اسلامی نظام میں شارع کی ہدایات کے تحت قانونی طور پر محکمۂ احتساب امراء اور عوام کی ان سارے مفاسد سے روک دے گا، اور ظاہر ہے کہ یہ اجتماعی دولت کو محفوظ کرنے اور معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے اور امراء و عوام میں اخوت و مساوات پیدا کرنے کی بہترین صورت ہے۔ ان مفاسد سے معاشرے کو پاک کردینے کے بعد معیارِ زندگی ایسا سادہ ہو جاتا ہے کہ پھر ہمارے ہاں کی محنت کی اجرتیں اور اشیاء کی قیمتیں اور روپے کی قوت خرید بین الاقوامی مارکیٹ میں بڑی بڑی قوموں کی معاشی برتری کو شکست دے سکتی ہے۔

مزید اجتہادی بندشیں | مندرجہ بالا سرفیات کی مختلف شکلوں کیا دران کے متعلق شریعت کے نواہی کی حکمتوں کو ملحوظ رکھ کر ایک اسلامی حکومت کی پارلیمنٹ یہ طے کر سکتی ہے کہ اسراف کے دوسرے مظاہر کون سے ہیں جن کی حرمت کے لئے اگر کوئی منصوص دلیل نہ ہو تو کم از کم وہ مشتبہات ضرور ہیں —— اور ان کی بندش کا اہتمام کر سکتی ہے۔ علاوہ بریں عام اوسط درجے کی زندگی کی ضروریات کو مستثنیٰ کر کے آرائش و زیبائش، جائز

تفریحات، اور خوشحالی اور آرام پسندی کے لوازم پر بڑھتے ہوئے ٹیکس لگا کر ان کے فروغ کو روکنے کی تدیجی کوشش کرے۔ اس سے بہ یک وقت دو فائدے ہوں گے، ایک یہ کہ لوگ ضروریات تک مصارف کو محدود رکھنے پر مائل ہوں گے، دوسرے یہ کہ عوام ملک کی اجتماعی ضروریات کے لئے فنڈ بہم پہنچ سکیں گے۔

بطور مثال یہ کہا جاسکتا ہے کہ غربا اور اوسط درجے کے گھرانوں کی ضروریات سے گراں قسم کے پارچات، برتن، فرنیچر، فرش، قالین، ریفریجریٹر، موٹر کاریں، کیمرے، ریڈیو سیٹ وغیرہ خریدنے والوں کو ملک کی اجتماعی ضروریات کے لئے مرکزی فنڈ میں ٹیکس داخل کرنا چاہئے۔ اسی طرح ریلوں میں فسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے والوں کے کرایوں کے ساتھ ایسا ٹیکس ضرور شامل ہونا چاہیئے جو تیسرے درجے کے مسافروں کی سہولیات کے لئے صرف ہو۔ اسی طرح جو لوگ دو منزلہ، سہ منزلہ اور طویل و عریض مکانات تعمیر کرنا چاہیں وہ جہاں اپنے آرام کے لئے بہت سا روپیہ صرف کرنے کی استطاعت کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہاں ان سے غربا کی ضروریات کے لئے بھی مناسب حصہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کرنے والوں پر اجتماعی ضروریات کا بار اس طرح بخوبی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اسرافیات کے کاروباری اڈے | موجودہ سوسائٹی میں اسرافیات اور تعیشات کے دلدادگان کے لئے باقاعدہ کاروبار ہوتے ہیں اور اڈے قائم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں بے شمار مراکز بدکاری قانون کی سرپرستی میں قائم ہیں، کتنے ہی شراب خانے کھلے ہیں، لاکھوں ہی سینما چل رہے ہیں، کئی رقص گاہیں ہیں، بہت سے قمار خانے ہیں اور ان کے ذریعے اسراف اور عیاشی کی باقاعدہ تبلیغ ہوتی ہے۔ علاوہ بریں حکومت کے ریڈیو اسٹیشن بھی لوگوں کی تعیش پسندیوں کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ اور لٹریچر بھی آرٹ کے خوشنما نام پر لہو و لعب کے اخلاق سوز اسباب کو فروغ دیتا ہے۔ اور مصوری و بت تراشی رہی سہی کسر پوری کر دیتی ہے۔

ان اڈوں کو جن کے ذریعے سرمایہ دار لوگ عوام کا اخلاق بگاڑ کر روپیہ کماتے ہیں، بند کئے بغیر معاشی ناہمواریوں کا سدباب کرنا ممکن نہیں ہے۔ رہا ریڈیو اور سینما کا معاملہ، سو ان دونوں ذرائع تعلیم و تربیت کو عوام کی ذہنی، اخلاقی، معاشرتی، زرعی، صنعتی اور سیاسی ترقی کے لئے استعمال ہونا چاہیئے، نہ کہ معاشقے اور بے حیائی کے ہنر سکھانے کے لئے! یہ بجا کہ ریڈیو اور سینما میں جائز قسم کی تفریحات رکھی جاسکتی ہیں۔ مگر لغویات کے لئے

بہر حال ان بہترین ذرائع کو وقف رہنے دینا کسی اسلامی حکومت کے لئے جائز نہیں ہے۔

اسلامی قانونِ وراثت کا نفاذ نظامِ سرمایہ داری کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک شخص کی جمع شدہ دولت اور جائداد کو حتی الوسع یکجا رکھا جاتا ہے اور مرتکز شدہ سرمائے کو جوں کا توں اولادِ اکبر کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اسلام اس کے عین بالمقابل ایک فرد کی زندگی بھر کے اندوختے کو اس کی وفات پر کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ بنابریں اسلامی قانونِ وراثت معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے اور دولت کو پھیلانے کا ایک نہایت ہی کامیاب ذریعہ ہے۔ اس قانون کے حسب ذیل خواص کو ذہن نشین کیے بغیر اس کے معاشی عمل کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) اس قانون کے تحت ۸ ایسے مستقل ورثا ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو لازماً متوفی کے ترکے میں سے حصہ ملتا ہے۔

(۲) اس قانونِ وراثت کے تحت ذکور کے ساتھ اناث بھی شریک ترکہ ہوتی ہیں، لہٰذا اس کے ذریعے دولت کا پھیلاؤ بہت زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔

(۳) یہ قانون دوسرے اعزہ کے ساتھ خاوند کے ترکے میں سے بیوی کو اور بیوی کے ترکے میں سے خاوند کو اہم حصہ دلواتا ہے اور یہ قاعدہ ایک برادری کے اموال کو دوسری برادری میں منتقل کرنے پھیلاؤ کی رفتار تیز تر کر دیتا ہے۔

(۴) یہ قانون ذوی الفرائض (اول درجے کے ۸ ورثا) کے ساتھ ذوی الارحام (دوسرے درجے کے ورثا) کے علاوہ عصبات (تیسرے درجے کے ورثا) کو بھی ترکے کا حقدار قرار دیتا ہے، اِلّا یہ کہ از روئے قانون الاقدم فالاقدم کے اصول پر بعض کو حصہ نہ پہنچتا ہو۔

(۵) اس قانون کی رو سے ہر شخص اپنے ترکہ کے ⅓ حصے کے بارے میں دو طرح کی وصیتیں کر سکتا ہے، بلکہ اسے ترغیب دی گئی ہے کہ وہ کرے اور بعض علماء کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے:۔

۱۔ اسٹیٹ، عوامی ضروریات، رفاہِ عامہ اور تحریک اقامتِ دین کے لئے وقف کرنا۔ ب۔ قانونی طور پر ترکہ نہ پانے والے اعزہ یا محسن دوستوں یا پڑوسیوں اور خادموں کو حصہ دلانا۔

(۲) اس قانون کی رُو سے لاوارث لوگوں کے ترکے بیت المال میں داخل ہو کر مفادِ عامہ کیلئے مخصوص ہو جاتے ہیں۔

ان اشارات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانونِ وراثت بڑے وسیع معاشی اثرات رکھتا ہے اور یہ جہاں نافذ ہو، وہاں دولت چند تجوریوں میں مقید نہیں رہ سکتی اور نہ چند کارخانہ داروں اور زمینداروں کی معاشی اجارہ داری قائم رہ سکتی ہے۔

کمیونسٹ حضرات عموماً اسلامی قانونِ وراثت کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ اگر اسلام کے ذرائع سے معاشی مسئلہ حل ہونے لگے تو ان کا کیا کام باقی رہ جائے گا۔ کاش کہ وہ دیانت داری سے اس قانون کے معاشی عمل کا اسی طرح تحقیقی مطالعہ کریں جس طرح وہ "نظریۂ قدرِ زائد" Surplus Value کو سمجھنے کے لئے دماغ کھپاتے ہیں۔ ان حضرات کی خدمت میں درخواست ہے کہ آپ براہ کرم ایک کاغذ پنسل لیجئے اور پاکستان کے حالات پر اس قانون کو منطبق Apply کرکے دیکھئے کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ آج ہم ۶ کروڑ افراد میں سے خوش حال لوگوں کی تعداد ۲ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور بقیہ ۴ کروڑ مفلس، فاقہ کش، مفلوک الحال، گداگر اور ضروریاتِ زندگی سے محروم ہیں۔ آپ ایک حساب داں کی طرح اعداد و شمار کو مرتب کرکے نتیجہ نکالئے کہ اگر شرحِ اموات ۲ فی ہزار اور متوفیاں کے اوسط ورثاء اسلامی قانون کے مطابق ۴ قرار پائیں (حالانکہ عملاً یہ تعداد ۱ سے لے کر ۱۰، ۱۵، ۲۰ اور ۴۰ بلکہ اوپر تک جا سکتی ہے) تو دو کروڑ افراد کی خوشحالی کتنی مدت میں ۶ کروڑ افراد میں منتقل ہو سکتی ہے؟

یہ اعداد و شمار کا ایک صاف اور سیدھا سا حساب حیرت انگیز نتائج تک لے جاتا ہے یعنی کل ۲۰ سال کی مدت میں ہماری پوری قومی دولت ۶ کروڑ افراد میں پھیل جاتی ہے اور غیر معمولی قسم کی اونچ نیچ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اس صورت میں جب کہ اسلامی نظام میں صرف "قانونِ وراثت" ہی واحد ذریعہ ہو انتشارِ دولت کا، لیکن اگر زکوٰۃ اور دوسرے ذرائع بھی کام کریں تو پھر زیادہ سے زیادہ مدت جو مساواتِ عامہ پیدا کرنے کے لئے درکار ہے وہ ۱۰ سال سے زائد نہ ہوگی۔

یہ دس سالہ خاموش اور پُرامن اور غیر خونی انقلاب اگر اسلامی قانونِ وراثت اور اس کے دوسرے ذرائع اصلاح کے بل پر اس سے بہتر نتائج دکھا دے جتنے کہ روس میں اشتراکیت کے طبقاتی تصادم کے خونی

ہنگامے اور قتل و غارت کے طوفان نے دکھائے ہیں تو آخر اسلام کے ہوتے ہوئے کیمونزم کی طرف توجہ کرنے والوں سے زیادہ رجعت پسند اور غیر معقول (Unrationalist) اور کون ہوگا؟ یہاں نہ شخصی آزادی سلب کی جائیگی، نہ سی، آئی، ڈی کا جال بچھایا جائے گا، نہ فوجی عدالتوں کا دور دورہ ہوگا۔ نہ محنت گھروں (Dealinas) میں ہزاروں آدمیوں کو محبوس کرنا پڑے گا، نہ سرحدیں بند کی جائیں گی، نہ جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے کی ضرورت ہوگی، اور کام اس سے بہتر ہوگا جتنا کہ اشتراکیت نے ۳۰ سال کے مصارف اور تشدد کے بعد کر کے دکھایا ہے۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ اسلام نے اپنے معاشی انقلاب کی اسکیم کو اپنے پورے نظام میں اس طرح جذب کر دیا ہے کہ جہاں یہ نظام چلا، بغیر اس کے کہ آپ سرمایہ دار اور کارخانہ دار کے خلاف طبقاتی جنگ کا بگل بجا کے میدان میں آئیں، از خود سرمایہ داری کی جڑیں کٹنے لگتی ہیں۔

آپ غور کیجیے کہ آج ہم میں سے جو ۲۰، ۲۵ ہزار افراد بڑی بڑی زمینوں اور کارخانوں اور تجارتوں کے مالک ہیں، ان سے جب اسلامی نظام یہ مطالبہ کرے گا ـــــ کہ اپنی موجودہ املاک کا جو جو حصہ انہوں نے اپنے کسی مورث سے حاصل کیا ہے، اس میں سے اپنا شرعی حصہ رکھ کر بقیہ کو دوسرے حصہ داروں کے حوالے کر دیں تو آناً فاناً یہ بڑے بڑے املاک ۴، ۷، ۱۰، ۲۰ ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے اور کئی کاروبار انفرادی ملکیت سے نکل کر ایک دم لمیٹڈ فرموں اور کمپنیوں کی شکل میں بدل جائیں گے۔ اسلامی قانون وراثت کا ایک ہی وار غریبوں میں سے ۱½ ، ۲ لاکھ افراد کو اوپر اٹھا کر انہیں ایسے املاک کا مالک بنا دے گا جن کے بارے میں کل وہ خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے ـــــ اور اسی طرح ہر سال اور ہر روز اس قانون کے انجوبے اپنا کام کرتے رہیں گے۔

یہ مخصوص ملکیتوں کو عوامی ملکیتوں میں بدلنے کا بہت ہی معقول، پاکیزہ اور تیز رفتار ذریعہ ہے اور اس کی مزاحمت کی جرأت کسی مسلم سرمایہ دار، زمیندار کو نہیں ہو سکتی۔ سرمایہ دار کمیونزم کے خلاف ضرور زور کرے گا، لیکن اسلام کے منہ آنے کی جرأت وہ کبھی نہیں کر سکتا، اگر وہ قانون اسلامی کو قبول کرنے سے انکار کرے گا تو اسکی جگہ مسلم سوسائٹی میں نہیں بلکہ ریاست کے "اہل ذمہ" میں ہوگی۔

کفالت عامہ اسلامی حکومت دستوراً اور اخلاقاً دونوں طرح اپنے شہریوں کو رفاہ عامہ کے اجتماعی

کاموں کے علاوہ بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ضمانت دینے کی پابند ہے، جہاں تک کہ اس کے ذرائع کی وسعت ہو! اسلامی بیت المال اکابر کو تنخواہیں جمع کر کے دینے والا ادارہ نہیں ہے، بلکہ وہ پورے شہریوں کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے۔ موجودہ دور کی حکومتیں کفالت عامہ کی ذمہ داری نہیں لیتیں، بلکہ صرف رفاہِ عامہ کے کاموں تک، اجتماعی خزانے کے مصارف کو محدود رکھتی ہیں۔ فوج، پولیس، تعلیم، صحت، ذرائع آمدورفت وغیرہ کا اہتمام کئے بغیر تو کوئی سلطنت چل ہی نہیں سکتی، اس میں اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اسلامی حکومت کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ رفاہِ عامہ کے ساتھ کفالتِ عامہ کی ذمہ داری لیتی ہے اور اسکی طرف سے ہر شہری کو ضمانت دی جاتی ہے کہ زندگی جاری رکھنے کے لوازم ہیں ہے اگر وہ کسی سے محروم ہوگا تو حکومت اور سوسائٹی اسے پورا کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ اسلامی نظام معیشت کا یہ ایک ایسا اصول ہے جس کے ہوتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کے سارے مفاسد کا سدباب ہو جاتا ہے اور کمیونزم کے دین معدہ کی قدر و قیمت اس کے مقابلے میں ہیچ رہ جاتی ہے۔

نظام سرمایہ داری کی مرکزی روح انفرادیت پسندی ہے یعنی ہر فرد صرف اپنا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن اسلامی نظام معیشت میں سوسائٹی ——— اور اسکی معرفت خوشحال لوگ ——— ہر ضرورت مند کے بارے میں ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی نظام یہ ضمانت دیتا ہے کہ مزدور اور کسان مفلس ہوں، یا کوئی عام شہری بے روزگار ہو، تو اسکی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے سرکاری خزانہ ہمہ تن حاضر ہوگا۔ تو پھر اسکی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے کہ تمام افراد کی ملکیتیں سلب کر کے ان کو اسٹیٹ کا مزدور بنا دیا جائے؟

درحقیقت یہ کفالتِ عامہ کا اصول ہی اسبات کا متقاضی ہے کہ مسلم سوسائٹی سے زکوٰۃ و صدقات وصول کر کے ایک مرکزی فنڈ بہم پہنچایا جائے اور اس کا ایک بڑا حصہ افرادِ معاشرہ کی شخصی اور نجی ضروریات کے لئے مخصوص رکھا جائے۔ یہ واضح رہے کہ فقراء و مساکین، ایامیٰ و یتامیٰ اور بیماروں اور معذوروں کی اعانت صرف افراد پر ہی واجب نہیں ہے، بلکہ حکومت اسلامی بدرجہ اول اسکی ذمہ دار ہے، کیونکہ اس

کے ذرائع وہ وسائل وسیع تر ہوتے ہیں۔

نبی صلعم اور کفالت عامہ | نبی صلعم کا دورِ حکومت دائمی اسوہ ہے آپ نے سائلین اور ضرورتمندوں کو اجتماعی خزانے سے ہمیشہ امداد بہم پہنچائی ہے۔ پھر آنحضور کے شخصی اور سرکاری مصارف کے لئے خمس، فئے و غنیمت (اور باغ فدک) میں جو حق مقرر کیا گیا تھا اسے آپ نے ہمیشہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کے ضرورت مندوں پر صرف کیا ہے۔ زاد المعاد میں بتایا گیا ہے کہ آنحضور اپنی خاص رقم میں سے مقروضوں کا قرضہ ادا کرتے تھے، کنواروں کی شادیاں کرتے تھے اور اہلِ حاجت کو دیتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک بے روزگار شخص سائل بن کر پہنچا تو آپ نے اسے لکڑیاں کاٹ کر بیچنے کے کام میں لگایا اور تاکید کی کہ مجھے اپنے معاشی حالات سے مزید مطلع رکھو۔ مدعا یہ تھا کہ اگر کام نہ چل سکا تو پھر کوئی دوسری تدبیر کی جائیگی۔ خود یہ مثال بتاتی ہے کہ بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا یا اس بارے میں ان کی رہنمائی کرنا، اور اگر وہ کامیاب نہ ہوں تو پھر ان کی مالی امداد کرنا اسلامی حکومت کے ذمے ہے۔

حضرت عمرؓ اور کفالتِ عامہ | حضرت عمرؓ کے دور میں چونکہ اسلامی نظام پوری طرح برقرار ESTABLISH ہوچکا تھا، اس لئے کفالت عامہ کی مثالیں اس دور میں بہت ہی نمایاں قسم کی ملتی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) آپ نے اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے عام حکم تھا۔۔۔ اور اس کی ہمیشہ تعمیل کی گئی۔۔۔ کہ اپاہج، ضعیف، از کار رفتہ، مفلوج وغیرہ ضرورتمندوں کو بیت المال سے وظائف دیئے جائیں۔

(۲) غرباء و مساکین کے لئے بلاتخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزینے مقرر کر دیئے جائیں۔

(۳) شہروں میں مہمان خانے تعمیر کر دیئے گئے، جہاں مسافروں کو بیت المال کی طرف سے کھانا ملتا تھا (مدینہ منورہ کے لنگر خانے میں آپ خود تشریف لے جاکر اپنے اہتمام سے کھانا کھلواتے تھے)

(۴) اولادِ لقیط (لاوارث بچے) کے لئے رضاعت و تربیت کے مصارف بیت المال سے ادا ہوتے

تھے۔ ابتداً اس سلسلہ میں ۱۰۰ درہم سالانہ فی بچہ مقرر ہوئے، لیکن بعد میں اضافہ کیا جاتا رہا۔

(۵) یتیموں کی پرورش سرکاری انتظام سے ہوتی تھی ان کی جائدادوں کی دیکھ بھال بھی اسٹیٹ کے ذمے تھی ——— اور بالعموم یتیموں کے سرمائے کو تجارت میں لگا کر اسے بڑھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔

(۶) اسلمؓ (حضرت عمرؓ کے غلام) کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات کو گشت کرتے ہوئے مدینے سے تین میل کی دوری پر مقام صرار کے ایک گھر میں بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ بچے بھوکے ہیں اور سامان خوراک ختم ہے۔ اسی وقت مدینے واپس تشریف لائے اور بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں، اور اسلم سے کہا، میری پیٹھ پر یہ بوجھ لاد دو۔ اسلم نے خود اٹھانا چاہا۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم میرا بار قیامت کو نہیں اٹھاؤ گے، تو اب میں تم کو کیوں اٹھواؤں۔ چنانچہ سامان منزل مقصود پر پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے خود چولہا جھونکا، کھانا تیار ہوا تو بچوں نے کھایا پیا اور اچھلنے کودنے لگے۔ بچوں کی والدہ نے کہا کہ امیرالمومنین بننے کے قابل تم ہو، نہ کہ عمرؓ!

(۷) ایک مرتبہ مدینہ کے باہر ایک قافلہ آکے اترا۔ حضرت عمرؓ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو لے کے وہاں پہنچے اور رات بھر ان کی حفاظت کے لئے پہرہ دیتے رہے۔

(۸) ایک مرتبہ ایک بدو نے اشعار میں اپنے اہل وعیال کے لئے لباس کا مطالبہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ میں تمہارا کہنا پورا نہ کروں تو کیا ہوگا؟ بدو نے جواب میں یہ شعرِ مثلث پڑھا:-

تکون عن حالی لتسئلنّہ	تجھ سے قیامت کے دن میری نسبت
والواقف المسئول بینتنّہ	سوال ہوگا۔ اور تو ہکا بکا رہ جائیگا۔
اما الیٰ نار واما جنّۃ	پھر یا دوزخ کیطرف جانا ہوگا، یا بہشت کیطرف!

حضرت عمرؓ یہ سن کر اتنا روئے کہ ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ پھر اپنا ایک کرتہ اسے دیتے ہوئے

لہ حضرت عمرؓ نے اس جملے میں یہ بتا دیا ہے کہ اگر کوئی حکومت کفالتِ عامہ کی ذمہ داری ادا نہ کرے اور اسکے شہری بھوک، بیماری اور دوسری محرومیوں میں مبتلا رہیں تو اسکے چلانے والے خدا کی عدالت میں ہر محروم فرد کیلئے جوابدہ ہونگے۔

معذرت کی کہ اس وقت میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔

(۹) سعید بن یربوع ایک نابینا صحابی تھے۔ ان کو نماز باجماعت میں آنے کے لئے خادم فراہم کر دیا گیا۔

(۱۰) ایک شخص کا دایاں ہاتھ کٹا دیکھا اور پھر کہنے لگے کہ تم کو وضو کون کراتا ہوگا؟ سر کون دھلاتا ہوگا؟ کپڑے کون پہناتا ہوگا؟ یہ کہہ کر بہت رقت طاری ہوئی اور پھر ایک نوکر مقرر کر دیا اور ضروری سامان فراہم کیا۔

(۱۱) ایک بوڑھے ذمی کو مانگتے دیکھا تو فوراً اس کے لئے وظیفہ دینے کا فرمان جاری کیا۔

(۱۲) ازالۃ الخفا میں ہے:۔

وكان ابا العيال حتى ان كان	حضرت عمرؓ غازیوں کے کنبوں کے لیے "ابو العیال" تھے۔
ليمشي الى المغيبات فيسلم عليهن	مجاہدوں کی غیر حاضری میں ان کی مستورات کے گھروں پر جاتے
ثم يقول الكن حاجة؟ اذا	دروازوں پر جا کر سلام کہتے، پھر پوچھتے کہ کیا کوئی ضرورت پیش
كنتن تردن حاجة اشتري لكن شيئًا	ہے؟ اگر تمہیں کسی طرح کی ضرورت ہو تو میں تمہارے لئے بازار
من السوق فاني اكره ان تخدعن في	سے سودا لادوں، کیونکہ میں مناسب نہیں سمجھتا کہ خرید و فروخت
البيع والشراء، فيرسلن معه بجواريهن	میں دھوکا کھاؤ۔ چنانچہ مستورات ان کے ساتھ لونڈیاں بھیج
فيدخل السوق وان وراءه من	دیتیں اور آپ بازار جا پہنچتے۔ بہت سے لوگوں کے لونڈی
غلمان الناس وغلمانهم ما لا يحصى	غلام آپ کے ساتھ ہوتے اور آپ ان کی ضروریات خریدتے۔
فيشتري لهن حوائجهن ومن كانت	اگر کسی کے پاس ضروریات خریدنے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو اسے
ليس عنده منهن شيء اشترى	اپنے پاس سے خرید کر دیتے اور جب کبھی کوئی قاصد کسی لشکر
لها من عنده واذا قدم الرسول	سے آیا تو آپ بنفس نفیس ان کے گھروں تک ان کے
من بعض البعوث يتبعهن هو	شوہروں کے خطوط پہنچاتے اور ان سے فرماتے کہ تمہارے
بنفسه بكتب ازواجهن ويقول	شوہر خدا کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں اور تم رسول اللہ
لهن ان ازواجكن في سبيل الله وانتن	کے شہر میں ہو۔ پس اگر تمہیں کوئی خط پڑھ دینے والا میسر
في بلد رسول الله، ان كان عندكن	ہو تو خیر، ورنہ دروازے کی اوٹ میں آؤ تاکہ میں تمہیں

كن من بعيد ولا فادنين من الباب حتى
اقرأ لكن ثم يقول ان رسولنا يخرج يوم كذا
وكذا فاكتبن حتى نبعث بكتبكن ثم
يدور عليهن بالقراطيس والدواة
فمن كتبت منهن اخذ كتابها ومن
لم تكتب قال هذه قرطاس ودواة
ادني من الباب فاملي علي فيما كذا وكذا
بابًا فيكتب لاهله ثم يبعث بكتابهن

پڑھ کے سنا دوں۔ پھر فرماتے کہ ہمارا قاصد فلاں فلاں دن
روانہ ہونے والا ہے۔ سو تم اس کی روانگی سے پہلے پہلے
اپنے خطوط لکھ رکھو تاکہ ہم تمہارے خطوط روانہ کر سکیں۔
پھر آپ کاغذ قلم دوات لے کر ان کے گھروں کا دورہ کرتے
اور جس کسی نے خط لکھ رکھا ہوتا اس سے لے آتے اور جس
نے نہ لکھ رکھا ہوتا اسے کہتے یہ ہے کاغذ اور قلم دوات،
دروازے کے قریب ہو جاؤ اور مجھے لکھواؤ۔ اسی طرح
کئی دروازوں پر جاتے اور اہل خانہ کے پیغام لکھتے اور
پھر ان خطوط کو بھجواتے۔

اس حوالے کو پڑھتے ہوئے آدمی پر رقت طاری ہو جاتی ہے کہ کس درجے کے شفیق لوگ تھے جن کے ہاتھوں اسلامی نظام چلا اور آج کی حکومتوں میں غربا و عوام کا کیا حال ہے کہ ان کی مزاج پرسی تک کرنا عمائدِ حکومت پر بار ہوتا ہے، کجا کہ وہ ایک ایک کی ضروریات پوری کرتے پھریں۔

(۱۳) حضرت عمرؓ کی طرف سے جملہ حکام کو رعایا کی بیمار پرسی کے لئے سخت تنبیہ تھی۔

(۱۴) سنہ ۱۸ھ کے قحط کے زمانے میں بیت المال کا تمام نقد و غلہ عوام پر صرف کر دیا۔ پھر صوبوں سے طلب فرمایا۔ قحط زدہ عوام کی فہرستیں تیار کرائیں، ان کی ضروریات نام بہ نام درج رجسٹر کرائیں۔ اور ان کے لئے قراطیس (Ration Cards) مہر لگا کر جاری کئے۔ قراطیس کے اندراج کے مطابق مقررہ مقدار غلہ دی جاتی تھی۔ ہر روز ۲۰ اونٹ ذبح کرا کے اپنے اہتمام سے قحط زدوں کو کھانا کھلاتے تھے۔[لہ]

ان مثالوں سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت کی کفالتِ عامہ کی ذمہ داریاں کہاں تک وسیع ہیں۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ جب سفر شام کے لئے نکلے تھے تو راہ میں ایک خیمہ دیکھا۔ قریب

لہ اس موقع پر آپ نے اپنی خوراک کا معیار قحط زدہ لوگوں کے برابر کر دیا تھا اور فرماتے تھے جب تک ہر فرد رعیت کو آٹے کی روٹی اور روغن زیتون نہ ملے گا میں بھی نہ کھاؤں گا

گئے تو ایک بڑھیا نظر آئی۔ اس نے آپ کو پہچانے بغیر شکایت کی کہ حکومت کی طرف سے اسے کوئی مالی امداد نہیں پہنچی۔ حضرت عمرؓ نے معذرت کی کہ آخر عمرؓ کو اتنی دور سے تمہارا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کا جو جواب اس عورت نے دیا وہ کوئی بڑے سے بڑا فاضل سیاسیات بھی نہ دے سکیگا کہ

"جب اسکو رعایا کا حال معلوم نہیں تو خلافت کرتا کیوں ہے"؟

یہ فقرہ اسلامی حکومت کی کفالت عامہ کی ذمہ داریوں کا تصور دلانے کے لئے کافی ہے۔ حکومت خود اس کی ذمہ دار ہے کہ وہ ضرورت مندوں سے تعارف حاصل کرے اور ان کی ضروریات معلوم کرے ورنہ اس کے کارکن اس قابل ہیں کہ وہ معزول کر دیئے جائیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور کفالت عامہ | حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بنو امیہ کے ابتر نظام کو خلیفہ پاکر از سر نو درست کیا تھا۔ آپ کے دور روشن کا واقعہ ہے کہ غربا کو سرکاری لنگر سے کھانا کھلانے کا انتظام تھا۔ ایک مرتبہ محاسب یہ عرض کرنے حاضر ہوا کہ اگر لنگر جاری رہا تو بیت المال چند روز میں خالی ہو جائیگا۔ آپ نے جواباً فرمایا کہ لنگر جاری رہے گا اور بیت المال اگر خالی ہو جائے تو ہو جانے اس میں بھس بھر دینا۔ مدعا یہ تھا کہ بیت المال ہے ہی اس لئے کہ غربائے ملک کی ضروریات کا کفیل ہو یہی کام نہ ہوا تو اسے بھر کے رکھنے کی وجہ کیا ہے!

بحث کا ماحصل | پاکستان کے حالات کو موجودہ دورِ تمدن کے تقاضوں کے ساتھ سامنے رکھتے ہوئے اوپر کی ساری بحث کی روشنی میں جو ہدایت اخذ ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ:۔

(۱) ہماری حکومت کے لئے ایک مستقل محکمہ بندی کر کے اس امر کا انتظام کرنا لازم ہے کہ ملک کے تمام بیواؤں، یتیموں، بیماروں، لاوارث بچوں، اپاہجوں، اور نابیناؤں کی فہرست اس کے سامنے ہو اور ان کی ضروریات کا باقاعدہ حساب مرتب رہے۔ اور ان ضروریات کی بہم رسانی کا انتظام ہو۔

(۲) روٹی، کپڑے، دوا، مکان، سواری، خادم یا اور کسی طرح کے ساز و سامان کی جہاں بھی احتیاج پائی جائے بروقت فراہم کرنے کا نظم جاری ہو۔

(۳) ملک کے بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے دفاتر اور ذرائع و وسائل مہیا کئے جائیں۔ اور

جب تک ان کو کام نہ ملے، ان کو وظائف دے کر رفاہِ عامہ کے کاموں میں استعمال کیا جائے یا انہیں صنعتی وفنی تربیت دلا کر اور سرمایہ وآلات فراہم کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔ یہ ہے معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کی ایک عملی صورت جسے اسلامی نظام کے داعی نافذ کرنا چاہتے ہیں اور جسے نافذ کیے بغیر کوئی حکومت پوری طرح اسلامی حکومت ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہمیں بتایا جائے کہ جس نظام زندگی میں عوام کی معاشی دستگیری کا ایسا معقول انتظام موجود ہو اس سے بہتر انتظام کون سا ہوگا۔ اور ہم کمیونسٹ حضرات سے بھی دریافت کرتے ہیں کہ اس انتظام سے ان کو کیا اختلاف ہے۔

رفاہِ عامہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، کفالتِ عامہ کی طرح رفاہِ عامہ بھی اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔ ذرائع آمد و رفت، آبپاشی کے مسائل، زرعی اور صنعتی ترقیوں کے لیے مختلف انتظامات، رسل و رسائل کے انتظامات، تعلیم، صحت، انصاف اور جان، مال، عزت و آبرو، کی نگہداشت وغیرہ امور کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے لیکن اس سلسلے میں اسلامی حکومت اپنا ایک مخصوص مسلک رکھتی ہے اسلامی حکومت میں انصاف کے حصول کے لیے کسی قیمت کی ادائی کا کوئی قاعدہ کسی دور میں اختیار نہیں کیا گیا کہ جو اتنی فیس کورٹ ادا کر سکے (اور اس کے ساتھ رشوتیں بھی دے سکے) صرف وہی انصاف پا سکے۔ بخلاف اس کے اسلامی حکومت کا عدالتی نظام بلا فیس چلتا ہے، اور اس میں جج یا فریقین مقدمہ کو قانونی مشورہ بہم پہنچانے کے لئے "آزاد مفتی" بھی سرکاری بیت المال کے صرف پر کام کرتے ہیں۔

اس طرح اسلامی نظام تعلیم بھی دکانداری کے اصولوں سے بالکل پاک رکھا گیا ہے۔ اس میں فیس کا طریقہ نہیں کھپ سکتا کہ جو زیادہ مال رکھتا ہو، صرف اس کے بچے تعلیم پا سکیں، بلکہ دین و دنیا کی کم سے کم ضروری تعلیم تو حکومت اپنے ہر شہری کو مفت بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔ اس مقصد کے لئے اسکول، کالج، لائبریریاں، دار المطالعے، گشتی کتب خانے، تعلیمی فلمیں، ریڈیو سٹیشن کے عوامی مراکز، وغیرہ کا جیسا انتظام کرنا خود حکومت کا فرض ہے۔

پھر جہاں تک صحت کے تحفظ کا تعلق ہے، یہ بھی رعایا کی جانوں کی حفاظت کے فوجی انتظام کی طرح ہر غریب امیر ہر ایک کے لئے عام ہونا چاہئے۔ یہ ظلم ہے کہ صرف فیس معائنہ اور قیمت ادویات ادا کر سکنے والوں کے

لئے حکومت حفظانِ صحت کے انتظامات کر دے۔ لیکن جو لوگ مفلس ہوں ان کو بیماری اور موت کے حوالے کر دیا جائے کہ وہی ان کی چارہ گری کریں۔ اسلامی حکومت کے تحت صاحبِ استطاعت لوگوں کو حفظانِ صحت کے جتنے انتظامات بالمعاوضہ فراہم کئے جائیں، لازم ہے کہ وہ سارے کے سارے غربا کو مفت فراہم ہوں۔ ہمارے ایک غریب سے غریب شہری کو حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کے طبی معائنے، معالجے، اپریشن، اور دوا اور پرہیز کے لئے بہتر سے بہتر انتظامات سے بلا روک ٹوک استفادہ کرسکے۔ وہ اگر کسی ہسپتال کے خالی بستر (BED) کو حاصل کرنے کے لئے پہلے پہنچا ہو تو ملک کا رئیس سے رئیس شخص اس کی باری چھین نہ سکے انتظامات پورے عوام کے لئے مساویانہ ہونے چاہئیں، خواہ ان کا معیار پست ہو یا بلند!

یہ کام حکومت کا ہے کہ وہ مصارف کے لئے مالیات کو درست طور پر منظم کرے۔ امراء پر ٹیکس کا بار ڈالے اور مزدوروں اور کسانوں اور ملازموں کے مصارف تعلیم و علاج کے بل ان کے زمینداروں، کارخانہ داروں اور آقاؤں سے وصول کرے۔

زکوٰۃ اور اس کی معاشیاتی اہمیت

اسلامی حکومت کے کفالتِ عامہ اور رفاہِ عامہ کے انتظامات کا دارومدار مالیات کے حسنِ نظم پر ہے۔ اسکی ریڑھ کی ہڈی زکوٰۃ ہے جیسے کہ سود نظام سرمایہ داری کی اور قومی ملکیت کمیونسٹ نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لیکن قانونِ وراثت ہی کی طرح زکوٰۃ کا نام لینے پر بھی ہمارے بہت سے کمیونسٹ فکر حضرات "آں اُوں" کر کے رہ جاتے ہیں اور اس ذریعۂ انتشارِ دولت کی ماہیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس سے کسمساتے ہیں اور یہ رائے دیتے ہیں کہ آج کل کے مسائل پرانے زمانہ کے اس ذریعے سے حل نہیں ہو سکتے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے مسلم علمائے معاشیات میں سے کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ زکوٰۃ کی ماہیت اور اس کے اثرات کو معاشی نقطۂ نظر سے اعداد و شمار کے ساتھ پیش کرے اور پھر ایک قطعی فیصلے پر خود بھی پہنچے اور دوسروں کو پہنچائے۔ اس کمی کے مدِنظر میں نے کچھ عرصہ پیشتر زکوٰۃ کا معاشیاتی جائزہ اعداد و شمار کی روشنی میں لینا چاہا تھا، لیکن وہ کام بعض وجوہ سے نامکمل رہا۔ اب انشاءاللہ مستقبل قریب میں تکمیل دوں گا۔ تاہم میں نے ایک رف (اندازہ) اخبار تسنیم مورخہ ۴ مارچ ۱۹۴۹ء میں زکوٰۃ کی اس مقدار کا پیش کیا ہے جو ۱۹۳۵ء کے اعداد و شمار کی رو سے ایک سال میں صرف پاکستان سے ہم آمد ہونی چاہیئے۔ اس اندازے کے بارے میں

چند باتیں کہہ دینا ضروری ہیں۔

(۱) یہ اندازہ ۱۹۵۰-۵۳ء کے عدد و شمار کے مطابق ہے، لیکن کہیں کہیں ۱۹۳۰-۴۰ء کے اعداد و شمار بھی لئے گئے ہیں۔

(۲) غیر ملکی سرمائے کی مقدار کاروباری سرمایوں میں جو کچھ بھی ہو، اس کا زیادہ سے زیادہ اندازہ کرتے ہوئے نصف حصہ مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

(۳) کل انڈیا کا یکجائی اندازہ کرنے کے بعد تیسرے حصہ پاکستان کا متعین کر لیا گیا ہے۔

(۴) جہاں اعداد و شمار نہیں مل سکے وہاں سرسری تخمینہ سے کام لیا گیا ہے۔

(۵) اندازہ بحیثیت مجموعی کم سے کم قسم کا ہے۔

اس طرح جو اندازہ کیا جا سکا ہے وہ بہر حال ۳۰ کروڑ سالانہ سے اوپر ہے۔ یہ ۳۰ کروڑ روپیہ ہر سال خوشحال طبقہ سے ضرورت مند طبقہ کی طرف منتقل ہوتا رہے گا۔ تا آنکہ دونوں مساوات کی حالت پر آ جائیں۔ اگر اس مقدار زکوٰۃ کو ایک معقول منصوبہ بندی (Planning) کے ساتھ دس سال تک صرف کیا جائے تو سوسائٹی کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ مثلاً اسی ۳۰ کروڑ روپے کی رقم کو لیجئے اور اس کے دو حصے کر دیجئے:۔

(۱) ۱۵ کروڑ ان مصارف کے لئے جو حکومت کے ادارات افادۂ عمومی کی معرفت غرباء کے لئے کئے جاتے ہیں مثلاً تعلیم، حفظان صحت، عدالت وغیرہ۔

(۲) ۱۵ کروڑ براہ راست امداد بہم پہنچانے کے لئے مخصوص ہوں گے۔

(۳) مؤخر الذکر مقدار کو پھر دو گونہ صورتوں میں صرف کیا جا سکتا ہے۔

(الف) مستقل روزگار بہم پہنچانے کے لئے۔

(ب) وظائف دینے اور وقتی امداد بہم پہنچانے کے لئے۔

سلہ زکوٰۃ کی حقیقت کے بارے میں رجوع لینا چاہئے کہ یہ عام خیرات نہیں ہے بلکہ اسکی شرح اور اس کے مصارف کتاب و سنت سے متعین ہیں ... بنیادی عبادات کا اہم رکن ہے۔ زکوٰۃ کا مقصد سوسائٹی کی ساری ضروریات کو پورا کرنا نہیں بلکہ مرکزی مد ... و عامہ ... کو ... انتظامات کو قائم کرنا اور ملک کے ہر ضرورت مند فرد کو ضروریات بہم پہنچانے کیلئے ایک مضبوط فنڈ مہیا کرنا ہے۔ پھر زکوٰۃ کی ادائی انفرادی ... ہے بلکہ اسلامی حکومت اسکے وصول و صرف کا ویسا ہی انتظام کرنے کی ذمہ دار ہے جیسے کہ مالیاتِ عامہ (Public Finance) کے دوسرے پہلوؤں کا انتظام ...

مستقل روزگار کے سلسلے میں تین صورتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں:-

اوّل۔ کسانوں اور زراعت پیشہ لوگوں کو جو بے زمین ہوں یا کم رقبے رکھتے ہوں اُن کو قطعات اراضی خرید کر دیئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے اگر ۲ کروڑ روپیہ سالانہ صرف کیا جائے تو ۳ ایکڑ فی قطعہ کے حساب سے ۱۰۰۰۰ ایسے قطعات سالانہ خرید کر دس ہزار کنبوں کو فراہم کئے جا سکتے ہیں جن کی قیمت ۵۰۰ فی ایکڑ ہو یا اس صرف سے غیر مزروعہ رقبوں کو مزروعہ بنایا جا سکتا ہے گویا سالانہ ۳۰ ہزار ایکڑ زمین غربا کو خرید کر یا مزروعہ بنا کر دی جا سکتی ہے۔

دوم:- فنڈ کا دوسرا حصہ بقدر ۱ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ کارخانوں کے قیام کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے جن میں غریب اور حاجت مند لوگوں کو کارکن بھی بھرتی کیا جائے اور پورا عملہ کاران کا مالک ہو۔ حکومت صرف کامیابی سے ان کو چلا دینے کے لئے دو ایک سال نگرانی اور تربیت کا فرض انجام دے۔ اگر اعلیٰ درجہ کے بڑے کارخانے قائم کئے جائیں تو ایک لاکھ روپیہ فی کارخانہ سرمایہ لگا کر ۱۵۰ کارخانے سالانہ قائم ہو سکتے ہیں۔ ان کارخانوں میں سالانہ ۱۵۰۰۰ افراد اور ان کے ساتھ ان کے اسی تعداد کے کنبے کھپائے جا سکتے ہیں۔

سوم:- فنڈ کا تیسرا حصہ ۲ کروڑ روپے کا اگر تجارتی سرمایہ فراہم کرنے کے لئے مخصوص کیا جائے اور چھوٹے پیمانے کے کاروبار کے لئے ایک ہزار روپیہ فراہم کیا جائے تو سالانہ ۲۰ ہزار افراد (کنبوں سمیت) گذر کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

اب ہمارے پاس ۱۰ کروڑ روپیہ اور باقی ہے۔ اسکو اگر کچھ وقتی اور فوری امداد کے لئے اور کچھ یتیموں، بیواؤں اور بے روزگاروں[1] کو وظائف دینے کے لئے استعمال کیا جائے تو مختلف درجات کے مستحقین میں یوں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱)	۵ کروڑ روپیہ	ایک ہزار روپیہ سالانہ فی کنبہ	۵۰ ہزار کنبوں کے لئے
(۲)	دو کروڑ روپیہ	۵ سو " " "	۴۰ " " "
(۳)	ایک کروڑ روپیہ	۲ ½ " " " "	۴۰ " " "
(۴)	۲ کروڑ روپیہ	۱ " " " "	۲ لاکھ " "

[1] یعنی بے روزگاروں کو حکومت روزگار ملنے تک وظائف دے، ان سے رفاہ عامہ کے کاموں میں خدمات لیکر دولت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سارے حساب کے پیش نظر صرف ایک سال میں تین لاکھ ہزار کنبوں یا ۲۴ افراد فی کنبہ کے حساب سے ۱۵ لاکھ افراد کو افلاس کی دوزخ سے نکال کر خوشحالی کی جنت میں بسایا جا سکتا ہے۔ اگر یہی عمل ۱۰ سال تک جاری رہے تو ایک کروڑ پچاس لاکھ افراد کو معاشی استحکام کی منزل پر لایا جا سکتا ہے۔ یہ ہے وہ زکوٰۃ جسے حقیر سمجھا جاتا ہے۔ یہ اگر قانونِ وراثت کے ساتھ شامل ہو جائے تو حیرت انگیز انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ طبقات کی جنگ ہو اور خون کا کوئی ایک قطرہ بہے۔

دوسرے صدقات | زکوٰۃ صدقہ واجبہ ہے۔ اس کے علاوہ جو صدقات مسنون اور مستحب ہیں، وہ ایک تربیت یافتہ مسلم سوسائٹی میں بالعموم زکوٰۃ سے بڑھ جایا کرتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر ہم اپنی سوسائٹی کی تربیت حکومت کے وسائل سے اسلامی نقشے پر دو تین سال تک کریں تو حالات میں نمایاں ارتقا پیدا نہ ہو جائے۔ ان دوسرے صدقات میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں:۔

(۱) صدقۂ فطر (۲) قربانی (۳) نذر (۴) کفارۂ یمین (۵) کفارہ معصیت کبیرہ وصغیرہ (۶) ہدیہ صلوٰۃ وصوم (فوت شدہ) (۷) قرضِ حسنہ کی معافی (۸) طعامِ مسکین (۹) صدقہ برائے سائل (۱۰) اوقاف (۱۱) عام صدقاتِ جاریہ۔ وغیرہم

ان سارے صدقات سے اگر بالفرض گھٹیا حالات میں بھی امیر طبقہ سے غریب طبقہ میں سالانہ ایک قدر بقدر۔ اکروڑ بھی منتقل ہونے لگے تو زکوٰۃ کا اثر اور زیادہ دور رس ہو جانا چاہیئے، پھر اگر سوسائٹی دس سال تک تربیت پاتی رہے تو یقیناً صدقاتِ غیر واجبہ کی مقدار زکوٰۃ کے برابر ہو جانی چاہیئے۔

مقامِ غور و فکر | اس ساری بحث کے مطالعہ کے بعد غور فرمایئے کہ اگر ایک نظامِ اجتماعی ایسا عملاً برپا ہو جس میں!

(۱) عام طور پر دولت پرستی کی بجائے خدا پرستی؛ و تعمیر اخلاق پر توجہات مرتکز ہوں،

(۲) معاشیاتی اخلاق کی تعمیر اس طرح ہو چکی ہو کہ سرمایہ دارانہ ناہمواریوں کا پیدا ہونا ممکن نہ رہے،

(۳) سود، قمار، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹ، سٹے وغیرہ کا سدِ باب ہو چکا ہو،

(۴) اسراف و تعیش کے دروازے بند کیئے جا چکے ہوں اور تقریباتِ زندگی کو بالکل سادگی کی سطح پر لایا

جا چکا ہو،

(۵) ملازمین کی تنخواہوں کا معیار اعتدال کے اصول پر قائم ہو،

(۶) اہل محنت کے حقوق متعین ہوں اور ان کا قانونی و اخلاقی تحفظ ہو،

(۷) ایک ضرورتمند کو اس کے رشتہ دار، اس کے پڑوسی اور عام مسلمان بروقت مدد بہم پہنچانے کے لئے تیار ہوں،

(۸) حکومت اہل حاجت کی ضروریات کی کفیل ہو اور بے روزگاروں کی سرپرستی کرے،

(۹) قانون وراثت جائدادوں کو بار بار تکڑے تکڑے کر کے پھیلاتا چلا جائے،

(۱۰) زکوٰۃ و صدقات کی ایک بڑی مقدار ہر سال اوپر کے طبقے سے نیچے کے طبقے میں منتقل ہوتی رہے،

(۱۱) اور ہر فرد دوسرے کے ساتھ اخوت و مساوات کے روابط رکھتا ہو۔

تو بتایا جائے کہ اس میں معاشی ناہمواریاں، یا فاقہ و افلاس یا تقسیم طبقات کدھر سے دخل انداز ہو سکتی ہے!

پس اصل سوال یہ ہے کہ اس نظام اجتماعی کو عملاً بپا کرنے ——— اور جلد از جلد بپا کرنے ——— کی فکر کی جائے اور اسی کی دعوت لے کے ہم کھڑے ہوئے ہیں۔

حرف آخر حاضرین! یہ بات خوب اچھی طرح آپ کو سمجھ لینی چاہئے کہ یہ نظام جس کا خاکہ آپ کے سامنے بیان کیا گیا ہے، اس کا قیام کبھی بھی بجز اس کے ممکن نہیں ہے کہ اس نظام کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اسلام کو جاننے، سمجھنے اور اس کی مشین کو چلا سکنے کی صلاحیتیں رکھنے والی ایسی قیادت برسرکار ہو، جو کسی غیر اسلامی نظام سے مرعوب نہ ہو۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ پوری تاریخ انسانی میں ایک مثال بھی اس بات کی نہیں مل سکتی کہ اسلامی نظام زندگی اسلام کو نہ جاننے والوں اور اسلام پر نہ چلنے والوں کی قیادت میں بپا ہو سکا ہو، بلکہ چلے چلائے اسلامی نظام پر جب کبھی اس کے معیار سے گری ہوئی قیادت مسلط ہوئی ہے، تو اس کے بخیئے ادھڑ گئے ہیں۔ بخلاف اس کے جب کبھی بگڑے ہوئے حالات میں کوئی صالح قیادت بروئے کار آگئی ہے تو نظام زندگی کی چولیں از سر نو اپنی جگہ پر درست بیٹھ گئی ہیں۔ پس پاکستان اسلام کے معیار کے مطابق ایک صالح قیادت کو سامنے لانے میں جتنی دیر کرے گا، اتنی ہی دیر اسلام کے نظام حیات کے نفاذ میں لگے گی۔ یہ سمجھ لیجئے کہ اب حالات ایسے نہیں ہیں کہ اسلام

کو برسراقتدار کرنے اور اس کے نظام کو عملاً جاری کرنے میں دیر کی جائے۔ آج کمیونزم کا سیلاب آپ کے دروازوں
پر دستک دے رہا ہے۔ اس سیلاب کو محض اپنی قرارداد مقاصد کے خوشنما لیبل کا واسطہ دلا کر اور اپنے اکابر کی سن دوہ لینے والی
تقریروں کا حوالہ دے کر نہیں روک سکتے۔ صرف اسلام روک سکتا ہے۔

آج جو صورت حالات ہمارے ہاں کارفرما ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نام کا بورڈ تو ریاست پاکستان
کے دروازے پر لگ گیا ہے، لیکن اس کے اندر وہی سرمایہ دار، جاگیردار، نواب، چودھری، خطاب یافتہ حضرات اور جنہوں
کا کاروبار کرنے والے لوگ سرمایہ دارانہ نظام کی گدیوں پر نصب کئے زندگی کر رہے ہیں۔ نہ کسی صوبے کا راستہ طریق کار میں تغیر
آیا ہے، نہ لادینیت کے نگاہ اور اخلاق میں کوئی فرق پیدا ہوا ہے، نہ عادات و اطوار میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے، نہ زندگی
نظام کے ڈھانچے میں کوئی رد و بدل ہوا ہے۔ اس حال میں کیا یہ ممکن ہے کہ قانون قدرت کی بے لاگ طاقتوں کو ہم اسلام کا بورڈ
دکھا کر دھوکہ دے سکیں؟ اگر گھسا ہوا چل کو چلنے کا تجربہ اسے کچھ ہو نہیں سکتا کہ ہمارا معاشی نظام ہی جذبات کا سیل رواں جب
بند توڑ کے موجزن ہو تو جہاں موجودہ نظام کو بہا لے جائے وہیں اسلام کے بورڈ کو بھی بہا لے جائے۔ خالی بورڈ آخر کیا کر کے دکھا سکتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ قیادت جو اسلام کے بجائے دلوں کی گہرائیوں میں مغربی نظام حیات پر ایمان رکھتی ہے اور اسی
میں اپنی خیر و بقا کیلئے سارے راستے کھلے پاتی ہے، اور جسے نظام اسلامی کے برپا ہونے کا کوئی موقع نہیں ملا، اور جس کے پاس نظام
اسلامی کو چلانے کیلئے اخلاقی صلاحیتیں نہیں۔ وہ موجودہ نظام کو تسلیم کئے ہوئے پاکستان پر بالجبر مسلط رکھنا چاہتی ہے اور تعمیر
و اصلاح کی طاقتوں کا راستہ آخر دم تک روک رکھنا چاہتی ہے۔ پس اب کوئی صورت اسلامی نظام کے عملی نفاذ کی اس کے سوا نہیں
ہے کہ اس قیادت کو آئینی انتخابات میں برطرف کر کے نئی صالح قیادت کو بروئے کار لایا جائے۔

ہمارے موجودہ نظام اور ہماری موجودہ قیادت کیلئے قانون فطرت کی نگاہ میں اب کوئی معقول وجہ بقا باقی نہیں رہی۔
اب انقلاب بالکل مقدر ہو چکا ہے۔ امکانات اسی بات کے زیادہ ہیں کہ یہ انقلاب منظم ہوگا لیکن اگر ہمارے عوام نے
اسلام کو جلد از جلد برسر اقتدار لانے کیلئے متحد کوشش نہ کی تو یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام کا صحیح راستہ کھلا نہ پا کر انقلاب کی رو کمیونزم
کے غلط راستے سے سوسائٹی میں داخل ہو جائے اور ملک ایک بار کے بچے کھچے کو کر ایک دوسری دلدل میں چلا جائے۔

پس جماعت اسلامی ہر مسلمان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ آگے بڑھے اور اسلامی نظام اور اسلامی قیادت کو برپا کرنے کیلئے
جماعت اسلامی کی جدوجہد میں دل و دماغ سے، جسمانی قوتوں سے، وقت اور مال سے، زبان اور قلم سے پورا پورا تعاون کرے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

رسائل و مسائل

مولانا مودودی اور ان کے رفقا کی نظر بندی

(سلسلۂ واقعات کی تاریخ اور حکومت کے طرزِ عمل کا تجزیہ)

پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی کی گرفتاری مورخہ ۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مغرب اور عشا کے درمیان لاہور میں عمل میں آئی تھی اور اس کے چند ہی گھنٹے بعد طلوعِ آفتاب سے پہلے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کو راولپنڈی میں گرفتار کیا گیا۔ ابتداءً ان حضرات کو ایک ماہ کے لئے نظر بند رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ پھر میعاد میں اضافہ کر کے مدت نظر بندی کو چھ ماہ کر دیا گیا۔ پھر دوسری مرتبہ ۴ر اپریل ۱۹۴۹ء کو مزید چھ ماہ کا اضافہ کیا گیا اور اب ۳ر اکتوبر کو ان کے لئے رہائی کے احکام جاری کرنے کے بجائے نظر بندی کی مدت میں چھ ماہ کا اور اضافہ کر دیا گیا ہے۔ پبلک میں پہلے ہی اضطراب موجود تھا لیکن تازہ اضافہ نے اسے اور بڑھا دیا ہے۔ اس سلسلے میں پبلک ہمہ تن سوال بنی ہوئی ہے کہ یہ ماجرا کیا ہے اور اسے حکومت کا تازہ بیان مطمئن نہیں کر سکا۔ اس موقع پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سوال کے جواب میں اصل حقیقت کو واضح کر دیں۔ (ادارہ)

جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، نائب امیر مولانا امین احسن اصلاحی اور قیم جماعت (سیکرٹری) میاں طفیل محمد صاحب کی گرفتاری کا اصل پس منظر کیا تھا؟ یہ وہ سوال ہے جس سے بہت سے لوگ واقف ہو چکے ہیں لیکن بعض اصل حقیقت کے بارے میں اب تک مغالطے میں پڑے ہیں۔ ملک و ملت کے مفاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ گرفتاری کے اصل محرک کو پوری طرح واضح کر دیا جائے اور ان حیلوں اور بہانوں کی حقیقت کھول دی جائے جنہیں تشدد کو جائز کرنے کے لئے اربابِ حکومت نے اختیار کیا ہے۔

واقعات یہ ہیں:-

(۱) قیام پاکستان کے پانچ ماہ بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے جنوری ۴۸ ۱۹ء میں لاء کالج لاہور کے طلبہ کی دعوت پر تقریر کرتے ہوئے پہلی مرتبہ یہ سوال اٹھایا کہ پاکستان کا مطالبہ جس مقصد کے لئے کیا گیا تھا، اب پاکستان قائم ہوجانے کے بعد اس کو پورا ہونا چاہیے۔ یعنی یہ کہ اس ملک کا نظام حکومت اسلامی آئین پر قائم ہو، اور یہاں کا ملکی قانون (Law of the Land) انگریز کا چھوڑا ہوا یا انسانوں کا بنایا ہوا نہیں، بلکہ خدا کا بھیجا ہوا اور رسول صلعم کا لایا ہوا قانون ہو۔ پھر فروری ۴۸ ۱۹ء میں "اسلامی قانون" کے عنوان پر لاء کالج ہی میں مولانا کی تقریر ہوئی جس میں اسلامی آئین و قانون کے نفاذ کی عملی تدابیر پیش کرتے ہوئے مولانا موصوف نے بتایا کہ ہم نے اپنے سابق حکمرانوں سے جو کافرانہ نظام ورثہ میں پایا ہے اسے اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لئے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس امر کا اعلان کرے کہ:-

(ا) پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہے اور ریاست اس کے نائب کی حیثیت سے کام کرے گی۔

(ب) ریاست کا اساسی قانون شریعتِ خداوندی ہے جو محمد صلعم کے ذریعے ہمیں پہنچا ہے۔

(ج) تمام پچھلے قوانین جو شریعت سے متصادم ہوتے ہیں، بتدریج بدل دیئے جائیں گے، اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا جو شریعت کے خلاف پڑتا ہو۔

(د) ریاست اپنے اختیارات کے استعمال میں اسلامی حدود سے تجاوز کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

یہی وہ چار نکات ہیں جن کو جماعت اسلامی اور ملک کی دوسری جماعتوں نے اسلامی نظام کی بنیاد مان کر ملک کے گوشے گوشے سے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ دستور ساز اسمبلی ان کا اعلان کر دے۔

(۲) مارچ ۴۸ ۱۹ء کے آغاز سے جماعت اسلامی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی (امیر جماعت) کی رہنمائی میں اس مطالبہ کو حکومت سے تسلیم کرانے کے لئے باقاعدہ جدوجہد شروع کی۔ مارچ سے مئی تک لاہور، راولپنڈی، ملتان، کراچی، پشاور اور علاوہ بریں لائلپور، منٹگمری، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ میں جماعت نے بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوئے، جن میں یہی مطالبہ مولانا کی تقریروں کا موضوع تھا۔ ان جلسوں میں عوام اتنی اتنی بڑی تعداد میں شریک ہوئے کہ بعض جگہ یہ کہا گیا کہ اتنے لوگ کہاں سے آگئے ہیں۔ ان جلسوں میں مولانا نے عوام الناس اور تعلیم یافتہ طبقہ کو دینی دلائل سے اس امر پر پوری طرح مطمئن کر دیا کہ ان کی فلاح کلیتہً اسلامی نظام کے قیام سے

وابستہ ہے اور اسلامی نظام موجودہ دورِ تمدن میں پوری طرح قابلِ عمل، بلکہ دوسرے نظاموں کے مقابلے میں ترقی و استحکام کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ وہ تمام حیلے اور بہانے قطعاً غلط ہیں جو اسلامی نظام سے بچنے کے لئے کئے جا رہے ہیں۔ ان اجتماعات کے علاوہ مولانا مودودی صاحب، اصلاحی صاحب اور جماعت کے دوسرے کارکنوں نے ملک کے مختلف حصوں میں دورے کئے، رائے عامہ کو اس مطالبے کے حق میں منظم کرنے کی کوشش کی اور جگہ جگہ جلسے کر کے تقریریں کیں۔ نیز جماعت نے ایسا لٹریچر بھی تیار کرنا شروع کر دیا جس سے ایک طرف اسلامی نظام کا ہر پہلو روشنی میں آ رہا تھا اور دوسری طرف ان تمام مشکلات اور دقتوں کا حل بھی پیش کیا جا رہا تھا جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہی دراصل اسلامی نظام کے قیام میں حائل ہیں۔

(۳) ابھی اس جدوجہد کو چلتے ہوئے تین ہی مہینے ہوئے تھے کہ حکمران طبقہ اس سے پریشان ہو گیا اور اس کی پریشانی کے چار بڑے سبب تھے:۔

(الف) ایک یہ کہ دعوت اس اسلام کی طرف تھی جس کا نام لے کر پچھلے دس سال سے یہ حضرات مسلمانوں کے سروں پر سوار ہوئے تھے، اس لئے اب اس سے منہ موڑنا سخت مشکل تھا۔

(ب) دوسرے یہ کہ دعوت علمی اور عقلی دونوں حیثیتوں سے اتنی مضبوط تھی کہ اس کے مقابلے میں یارائے دم زدن نہ تھا۔ جو بات بھی کہی جاتی تھی، اس کی تردید ممکن نہ تھی اور جو عذرات بھی اسلامی نظام سے فرار کے لئے پیش کئے جاتے تھے ان کا پورا اور نہایت وزنی جواب بروقت مل جاتا تھا۔

(ج) تیسرے یہ کہ اس کی پشت پر ایک منظم، سنجیدہ اور مضبوط عملی تحریک موجود تھی جس کا طریق کار پہلی ہوائی تحریکوں کے طریقِ کار سے بالکل مختلف تھا۔

(د) اور چوتھے یہ کہ اس دعوت پر مسلمان پبلک نے یکایک ایسی کثرت اور شدت کے ساتھ لبیک کہا جس کی ان حضرات کو توقع نہ تھی۔ لاہور، راولپنڈی، ملتان، پشاور، سیالکوٹ، لائلپور، جھنگ، کراچی اور دوسرے مقامات پر جو عظیم الشان مجمعے مولانا مودودی صاحب کی تقریر سننے کے لئے جمع ہوئے، انہیں دیکھ کر پہلی مرتبہ حکمران طبقے پر یہ منکشف ہوا کہ ان کے جیسے ہی کوئی اور بھی ہے جس کی شخصیت اور جس کی بات عوام اور خواص کو اس طرح اپیل کرتی ہے۔

یہ وجوہ تھے جن کے پیشِ نظر ہمارے ملک کے اربابِ اقتدار کا ماتھا ٹھنکا اور ان کو محسوس ہوا کہ یہ خطرہ اگر بڑھ گیا تو پھر عہدو

کی کرسیوں پر قابض رہنا ممکن نہ رہے گا۔

قیام پاکستان سے پہلے جب یہ حضرات اسلام، اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کا نام لے لے کر ادھر کلمے درود پڑھ پڑھ کر مسلمانوں سے ووٹ لے رہے تھے اُس وقت ان کے ذہن میں ایسا کوئی اندیشہ نہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد فی الواقع انہیں اپنے ان وعدوں کو پورا کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ وہ مطمئن تھے کہ وہ مسلمانوں میں اپنی پارٹی کے سوا ہر دوسری پارٹی کا قلع قمع کر چکے ہیں اور ان کی شخصیتوں کے سوا سب شخصیتیں کچلی جا چکی ہیں۔ انہیں اسلام سے مسلمانوں کی عام ناواقفیت پر بھی پورا پورا بھروسہ تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اپنی پروپگنڈہ مشینری کے ذریعے سے وہ جس کفر اور فسق کو چاہیں گے اسلام بنا لیں گے۔ وہ عام مسلمانوں کی سادگی اور سادہ لوحی پر بھی اعتماد کئے ہوئے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ جس طرح اب تک ہم اسلامی احکام کی کھلی کھلی بغاوت کے باوجود محض اسلام کے نام سے مسلمانوں کو دھوکا دیتے رہے ہیں اور مسلمان دھوکا کھاتے رہے ہیں، اسی طرح آئندہ بھی اسلامی کاروبار زبانی جمع خرچ سے چلتا رہیگا۔ انہیں اگر تھوڑا بہت کچھ اندیشہ تھا تو "مولویوں" سے تھا، لیکن وہ اپنے پچھلے تجربات کی بنا پر جانتے تھے کہ مولوی اب آگے چلنے اور دنیا کو اپنے پیچھے چلانے کی طاقت کھو چکا ہے اور اسے ہم سیاست کے میدان سے باہر دھکیلنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ وہ کانگرس کی طرف گیا تو متبع بن کر اور لیگ کی طرف آیا تو بھی متبع بن کر ـــ یا پھر خاموشی کے ساتھ گوشوں میں بیٹھ کر دعا گوئی یا وعظ گوئی کرتا رہا۔ لہذا انہیں اطمینان تھا کہ "مولوی" کوئی بڑا خطرہ ثابت نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد جب وہ مسندِ اقتدار پر متمکن ہوئے تو انہوں نے بے کھٹکے اپنے ان وعدوں کو ٹھوکر مار دی جو اسلام کے نام پر ووٹ لیتے وقت وہ مسلمانوں سے کرتے رہے تھے، اور دستور ساز اسمبلی کے پہلے ہی اجلاس میں صاف صاف یہ نظریہ دنیا کو سنا دیا گیا کہ:۔

"پاکستان ایک لادینی (سیکولر اسٹیٹ) جمہوری ریاست ہوگا اور اس میں نہ ہندو ہندو رہے گا اور نہ مسلمان مسلمان ـــ مذہبی حیثیت سے نہیں، کیونکہ مذہب تو ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی حیثیت سے!"

اسلامی نظام کے حق میں بار بار دہرائے ہوئے وعدوں سے یہ صریح انحراف تھا جو قیام پاکستان کے پہلے ہی دن کیا گیا۔ دراصل یہ انحراف اس اطمینان پر کیا گیا تھا کہ عام مسلمان تو اس کے معنی اور نتائج کو سمجھ ہی نہ سکیں گے

اور خاص لوگوں میں ایسا کوئی نہیں ہے جو اسے چیلنج کرنے کی جرأت کر سکے۔ اگر کوئی چیلنج کرے گا بھی، تو بھی رائے عام کو اسلام کے حق میں منظم کرنے کی قوت کسے نصیب ہے؟ مگر جب اچانک ان کو اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا کہ ان کے مقابلے میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو عوام اور تعلیم یافتہ طبقہ میں اثر رکھتا ہے، اور وہ تنہا ہی نہیں، بلکہ ایسے تربیت یافتہ ذہین کارکنوں کا ایک بڑا دستہ بھی وہ تیار کر چکا ہے جو عوام کو ساتھ لے کے چل سکیں اور پھر اس کے ساتھ ایک منظم پارٹی بھی موجود ہے جو اسلامی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے کا بل بوتا رکھتی ہے، اور پھر علمی حیثیت سے بھی اسلامی نظام کا وہ نقشہ سامنے لاکر رکھ دیا گیا ہے جسے رد کرنے کے لئے کوئی بھی بہانہ نہیں بنایا جا سکتا تو انہوں نے محسوس کیا کہ فی الواقع وہ ایک خطرہ سے دوچار ہیں۔

خصوصیت سے ان کو یہ بات اچھی طرح محسوس ہو چکی تھی کہ ان کے بالمقابل اسلامی نظام کے جو داعی رائے عام کو منظم کر رہے ہیں، وہ نہ صرف یہ دین کی حقیقت کو سمجھنے والے ہیں، بلکہ جدید دور کے سیاسی اور معاشی نظاموں کے بارے میں بھی ان کا فہم و شعور پختہ ہے اور ان کی علمی صلاحیتیں برابر کی ٹکر کی ہیں۔

(۴) اب یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ سامنے سے اس "خطرے" پر وار کیا جا سکتا۔ مولانا مودودی صاحب اور ان کے ساتھی جن باتوں کی تبلیغ کر رہے تھے، ان میں سے کسی کو بھی جرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ شخصی اور جماعتی حیثیت سے جن کاموں پر ان کی اور ارکانِ جماعت اسلامی کی تمام مساعی صرف ہو رہی تھیں ان کے اندر بھی کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ اسکی بنیاد پر مولانائے ممدوح یا ان کے کسی رفیق کو پکڑا جا سکتا، اور اگر بغیر کچھ وجہ بتائے مولانا یا ان کے ساتھیوں پر ہاتھ ڈالا جاتا تو عام مسلمان اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد وہ جرم ہے جس پر انہیں پکڑا گیا ہے۔ لہٰذا اکابر حکومت نے ایک طرف تو یہ کیا کہ جماعت اسلامی کو انگریز کے قانون کے تحت سیاسی جماعت قرار دے کر سی۔ آئی۔ ڈی کی نگرانی اور خطوط کے سنسر کا سلسلہ شروع کر دیا اور دوسری طرف یہ سازش شروع کی کہ کوئی ایسا شوشہ چھیڑا جائے جس سے مولانا موصوف اور جماعت اسلامی کو پہلے بدنام کیا جا سکے اور پھر انہیں اور ان کے خاص خاص ساتھیوں کو گرفتار کر کے نظام اسلامی کی اس تحریک کا سارا جھگڑا ہی ختم کر دیا جائے کشمیر کا مشہور قضیہ دراصل اس سازش کا نتیجہ تھا۔ یہ قضیہ کس طرح اٹھایا گیا؟ اسکی اصلیت کیا تھی؟ اور اس سے کیا کام لیا گیا؟ ان سوالات پر حسب ذیل واقعات روشنی ڈالیں گے:۔

۱۔ کشمیر کے بارے میں مولانا کا نظریہ اول روز سے یہ تھا کہ یہ ریاست پاکستان ہی کا ایک حصہ ہے لیکن وہ ریاستوں کے بارے میں معاہدۂ تقسیم کے فیصلے کو مخدوش سمجھتے تھے اور ریڈکلف ایوارڈ کی رُو سے جب گورداسپور کا ضلع انڈین یونین کے حوالے کر دیا گیا تو ان کو کشمیر خطرے میں پڑتا محسوس ہوا۔ چنانچہ پاکستان میں آنے کے بعد مولانا نے خاص طور پر حکومت پنجاب کے ایک ذمہ دار ترین شخص سے خود جا کے ملاقات کی اور اسے یہ دعوت دی کہ کشمیر میں مسلمانوں پر جو ظلم توڑا جا رہا ہے اسے روکنے کے لئے اور مزید خطرات کے سدباب کے لئے آپ کو چاہیئے کہ آپ کھلم کھلا اپنی فوجیں بھیج کر اپنے حق کو محفوظ کر لیں اور اس معاملے میں جماعت کی طرف سے تعاون کا پورا پورا یقین دلایا لیکن شخص موصوف نے اس دعوت کو ٹال دیا۔ اس کے چند ہی روز بعد ہماری حکومت نے والیٔ ریاست کشمیر سے معاہدہ بحالیٔ تعلقات (Stand Still Agreement.) کرنے کی وہ غلطی کی جس کا نتیجہ بعد میں پاکستان کو بھگتنا پڑا۔ مولانائے موصوف کے یہی وہ احساسات تھے جن کو ۱۲ اگست کے بیان میں (ملاحظہ ہو: روزنامہ تسنیم مورخہ ۱۲ اگست) صاف صاف ظاہر کیا ہے کہ:

> کشمیر کے معاملے میں جو الجھنیں واقع ہوئی ہیں وہ سب ہمارے لیڈروں کی پیہم غلطیوں کے نتائج ہیں۔ انہوں نے ریاستوں کے متعلق بالکل ایک مبہم بات مان لی اور قطعی طور پر یہ طے نہیں کر لیا کہ کسی مملکت (Dominion) میں کسی ریاست کی شرکت کا فیصلہ والیٔ ریاست نہیں کرے گا، بلکہ باشندگانِ ریاست کریں گے۔ بلکہ وہ ہمارے ہی لیڈر تھے جنہوں نے اس خیال کی مخالفت کی۔ پھر انہوں نے سرحدوں کے تعین کا فیصلہ ریڈکلف اور ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور پیشگی لکھا دیا کہ جو سرحدی خط وہ کھینچ دیں گے اسکو یہ بے چون وچرا مان لیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورداسپور کا ضلع انڈین یونین میں شامل کر دیا گیا اور کشمیر کے ہندو رئیس کو ہندوستان کے ساتھ شامل ہونے کا راستہ مل گیا۔ پھر انہوں نے کشمیر کے ساتھ بحالیٔ تعلقات کا معاہدہ (Stand Still Agreement.) کر لیا اور جموں اور پونچھ میں جب مسلمانوں پر ظلم وستم ہو رہے تھے تو یہ خاموش بیٹھے دیکھتے رہے۔ پھر جب والیٔ کشمیر

انڈین یونین میں شامل ہو گیا اور ہندوستان نے وہاں فوجیں اتار دیں تو چند بیانات دینے کے سوا انہوں نے کچھ نہ کیا۔"[1]

ان سطور سے یہ شہادت مل سکتی ہے کہ مولانا کے سینے میں کشمیر کے لئے کتنا درد موجود تھا۔

باقی رہا وہ شرعی اختلاف جو مولانا کو اس طرزِ عمل سے تھا کہ حکومت ایک طرف تو دوستی کے معاہدے کرتی رہے جن کی وجہ سے کشمیر کے لئے کھُل کر لڑنا ممکن نہ رہے اور دوسری طرف خفیہ طور پر کچھ بے سروسامان لوگوں کو کشمیر میں بھیج کر شہید کرایا جاتا رہے، اس کی تبلیغ و اشاعت تو درکنار، انہوں نے اس کا ذکر تک کبھی کسی سے نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ جو لوگ شب و روز ان کے ساتھ کام کرنے والے تھے، ان کو بھی اس کے بارے میں کوئی علم نہ تھا کہ مولانا کشمیر کے مسئلے کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ یہ ان کی اپنی رائے تھی جو صرف انہی کے ذہن تک محدود تھی۔ وہ نہ کسی کو جنگ پر جانے کے لئے کہتے تھے اور نہ کسی کو جانے سے روکتے تھے، چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جماعت اسلامی کے دو یا تین ہمدرد باقاعدہ محاذ پر جاکر شریکِ جنگ رہے ہیں۔

مئی ۱۹۴۸ء کے دوسرے ہفتے میں جب جماعت اسلامی صوبہ سرحد کے اجتماع کے موقع پر مولانا موصوف پشاور گئے تو ایک صاحب ایک پرائیویٹ صحبت میں ان سے آکر ملے اور انہوں نے پوچھا کہ مولانا! آپ جہادِ کشمیر میں عملی حصہ کیوں نہیں لیتے؟ انہوں نے کہا کہ آپ اس سوال کا جواب دینے پر مجھے مجبور نہ کریں۔ میری اس معاملہ میں جو رائے ہے اسے ظاہر کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ انہوں نے پھر اصرار کیا اور مولانا نے پھر معذرت کی۔ تیسری مرتبہ انہوں نے کہا کہ اگر یہ کوئی شرعی مسئلہ ہے تو آپ اسے کیوں چھپاتے ہیں؟ تب مولانا نے ان کو بتایا کہ اس مسئلہ کی شرعی پوزیشن کیا ہے اور کس بنا پر وہ اس میں پوری طرح عملی حصہ لینے سے معذور ہیں۔ ان صاحب نے کہا کہ میں

[1] یہ واقعہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ لوگ جو کشمیر کے بڑے خیر خواہ بنے پھرتے تھے اور کشمیر کے نام پر مولانا موصوف کے خلاف محاذ بنائے ہوئے تھے، ان کی خیر خواہیٔ کشمیر کا حال یہ تھا کہ یہ عین اس زمانے میں کہیں تو شراب اور رقص و سرود کی محفلوں کی زینت بنے ہوئے تھے اور کہیں یہ اسمبلی کی سیٹ جیتنے کے لئے کرسیوں سے لڑائی لڑ رہے تھے، جب کہ کشمیر کے مورچوں پر ہمارے نوجوان اپنے سینوں پر گولیاں کھا رہے تھے۔ کشمیر کے جہاد کو اصل نقصان ان خیر خواہانِ کشمیر نے خود پہنچایا ہے۔

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!

آپ کی اس رائے کو اخبارات میں شائع کروں گا۔" مولانا نے جواب دیا کہ "اگر آپ ایسا کریں گے تو جتنا نقصان آپ مجھے پہنچائیں گے اس سے کہیں زیادہ نقصان کشمیر کے معاملے کو پہنچے گا۔ اعلان کرنا ہوتا تو میں خود ہی اس کا اعلان کر چکا ہوتا، آپ کی تشریف آوری کا انتظار نہ کرتا۔ مگر میں اس کا اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور نہ مناسب ۔۔۔ آگے آپ اپنے عمل کے مختار ہیں۔ اس گفتگو کے دوسرے ہی دن ان صاحب نے بڑی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ اسے پشاور کے ایک اخبار میں شائع کرا دیا، اور پھر مولانا کے لاہور پہنچتے پہنچتے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اور بعض دوسرے اخبارات میں بھی یہ خبر بہت کچھ غلط طریقے سے شائع ہوئی۔

دنیا یہ سن کر حیران ہوگی ۔۔۔ اور مولانا اور جماعت کے دوسرے لوگ بھی اس انکشاف پر سخت حیران ہوئے تھے کہ یہ صاحب جنہوں نے اس طرح پرائیویٹ مجلس میں مولانا سے ایک بات پوچھی اور پھر ان کے جواب کو کسی قدر تحریف کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلایا، یہ کوئی ہندوستانی حکومت یا مہاراجہ ہری سنگھ کے ایجنٹ نہیں تھے، بلکہ آزاد کشمیر گورنمنٹ کے نشر و اشاعت کے انچارج جناب نبی بخش نظامی تھے۔ ان صاحب کا نام اور منصب معلوم کرنے کے بعد شاید کسی موشمند آدمی کو بھی اس امر میں شک نہ رہے گا کہ یہ صاحب مولانا کے پاس خود نہیں آئے تھے بلکہ بھیجے گئے تھے۔ اور ان کا اس بات کو شائع کرنا کسی نادان بچے کی حماقت نہیں بلکہ خوب سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اگر یہ نبی بخش نظامی صاحب کی اپنی کارستانی ہوتی تو آزاد کشمیر گورنمنٹ اور حکومت پاکستان ان سے باز پرس کرتی اور ان کی اس حرکت پر کوئی سخت قدم ان کے خلاف اٹھاتی۔

۴۔ نبی بخش نظامی صاحب کا یوں بھیجا جانا، اور پھر مولانا سے گفتگو کے بعد ان کی رائے کو شائع کرنا، اور پھر سرکاری اثر کے تحت کام کرنے والے اخبارات کا اس کو اچھالنا، اور اس طرح اس کا بمبئی ریڈیو اور آل انڈیا ریڈیو تک پہنچنا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ پاکستان کے سربراہ کاروں نے خود اس بات کا انتظام فرمایا تھا کہ ہندوستان اور کشمیر کی حکومتیں اس رائے کو کشمیر کے جھگڑے میں پاکستان کے خلاف استعمال کریں اور پھر پاکستان کے مسلمانوں کو مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف بھڑکایا جا سکے۔ ہمارے اکابر کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ انہوں نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو نقصان پہنچانے کے

لئے جہادِ کشمیر تک کو نقصان پہنچانا پسند کر لیا۔

یہی سازش تھی جس کی وجہ سے حکومت پاکستان نے اپنے لاہور ریڈیو سے مولانا کے اس تردیدی بیان کو نشر کرنے سے انکار کیا جس میں جموں ریڈیو اور آل انڈیا ریڈیو کی غلط بیانیوں کو پوری طرح جھٹلایا گیا تھا۔ مولانا موصوف کا مذکورہ بالا بیان درج ذیل ہے۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ کشمیر کے متعلق میرے بیانات کو جموں ریڈیو، آل انڈیا ریڈیو اور شیخ عبداللہ صاحب کی حکومت نے بہت غلط معنی پہنا کر نشر کیا ہے اور اس سے جموں و کشمیر کی آزادی کے لئے لڑنے والوں کو، نیز اہلِ کشمیر کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے میں نے خود ان کے کسی نشری بیان کو نہیں سنا اور نہ کوئی شائع شدہ چیز دیکھی ہے لیکن ان کی جو باتیں معتبر ذرائع سے مجھ تک پہنچی ہیں وہ میرے منشاء کے بالکل خلاف ہیں۔ لہٰذا ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لئے میں حسب ذیل امور کی توضیح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

I میں کشمیر کو پاکستان کا ایک قدرتی حصہ سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک جغرافی، نسلی، تاریخی، معاشی، تمدنی، مذہبی، ہر لحاظ سے کشمیر پاکستان سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ ہندوستان سے۔

II میں قطعی طور پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ انڈین یونین نے ریاست کشمیر کی شمولیت قبول کر کے سخت غلطی کی ہے۔ جوناگڑھ کے معاملہ میں جس اصول پر اس نے اصرار کیا تھا۔ اسے خود کشمیر میں توڑ دیا۔ پھر دونوں جگہ دو متضاد بنیادوں پر فوجی مداخلت کر کے اس نے ایسی غلط پوزیشن اختیار کی ہے جسے کسی طرح حق بجانب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

III مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد انڈین یونین میں کشمیر کی شمولیت میرے نزدیک مسلمانانِ کشمیر کے لئے سخت مہلک ہے۔ ان کو ہندوستان کے ساتھ اور تمام دنیا کے ساتھ تعلق رکھنے کے لئے جس راستے سے گذرنا ہوگا۔ وہ پٹھان کوٹ سے لے کر نواح دہلی تک مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے۔ اور ایک مدتِ دراز تک وہ مسلمانوں کی آمدورفت کے لئے خطرناک رہے گا۔ یہ بھی کچھ بعید نہیں ہے کہ جن اغراض کے لئے پاکستان کی سرحد سے قریب کے تمام علاقے مسلمانوں سے

خالی کرائے گئے ہیں۔ انہی اغراض کے لیے کل کشمیر کو بھی مسلمانوں سے خالی کرانے کی کوشش کی جائے لہٰذا خود باشندگانِ کشمیر کی سلامتی بھی اسی میں ہے کہ وہ پاکستان سے اپنا تعلق جوڑیں۔ انہی وجوہ سے جماعت اسلامی یہ قطعی ارادہ رکھتی ہے۔ کہ وہ استصواب رائے کے موقع پر پاکستان کے حق میں اہل کشمیر کی رائے ہموار کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

IV۔ ریاست کشمیر کے مسلمان ڈوگروں اور ہندی فوجوں کے مقابلے میں اپنی جان، مال، آبرو اور آزادی بچانے کے لئے جو جدوجہد کر رہے ہیں اسے میں بالکل حق بجانب سمجھتا ہوں اور متعدد بار کہہ چکا ہوں کہ ان کی یہ جنگ اسلامی نقطۂ نظر سے جہاد کے حکم میں ہے۔

V آزاد سرحدی علاقے کے جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ محض خدا کے لئے اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کو گئے، اور جنہوں نے وہاں اسلامی حدود کی پابندی کرتے ہوئے جنگ کی، وہ بھی میرے نزدیک مجاہد ہیں۔ انہوں نے اپنا اخلاقی و دینی فرض انجام دیا۔ اور امید ہے کہ وہ خدا سے اپنا اجر پائیں گے۔

VI پاکستان کے باشندوں کے لئے بھی شرعاً میں یہ بالکل جائز سمجھتا ہوں کہ وہ کشمیر کی جنگِ آزادی میں خوراک، پوشاک، اور طبی امداد کی حد تک حصہ لیں۔ اگر مجاہدین کشمیر ان سے اسلحہ خریدیں تو وہ فروخت کرنے کے بھی شرعاً مجاز ہیں۔ لیکن جب تک حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کے درمیان معاہدانہ تعلقات قائم ہیں۔ میں براہ راست جنگی کارروائی میں ان کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا۔ شریعت کے احکام میری دانست میں یہی ہیں۔ اور اس کے خلاف جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان سے میرا اطمینان نہیں ہو سکا ہے مگر میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جو لوگ میری رائے کے خلاف کسی دوسرے عالم کے فتوے کی پیروی میں محاذ کشمیر پر جا کر لڑیں گے وہ حرام موت مریں گے۔ یہ بالکل ایک غلط بات ہے جو میری طرف منسوب کر دی گئی ہے۔

VII میری مذکورہ بالا رائے کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ حکومتِ پاکستان حکومت ہند کے ساتھ ان معاہدانہ تعلقات کو باقی رکھے اور پاکستان کے لوگ کشمیر کی جنگِ آزادی میں شرکت کرنے سے باز رہیں۔ اس کے برعکس میرا اصل منشا یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان ان تعلقات کو ختم کرکے ہمارے

راستے سے وہ شرعی اور اخلاقی رکاوٹ دور کر دے جو کشمیر کے لئے ہمیں اپنی پوری طاقت صرف کرنے سے روک رہی ہے۔ میں کشمیر کو پاکستان کی زندگی کے لئے ناگزیر سمجھتا ہوں میرے نزدیک اسے بچانے کے لئے اس سے بہت زیادہ کوشش کرنی چاہیئے جو اب تک کی گئی ہے۔ اور میں اچھی طرح یہ بات سمجھتا ہوں کہ یہ ظاہری تعلقات ہی اب تک اس راہ میں رکاوٹ بنے رہے ہیں۔

افسوس ہے کہ میرے بیانات کو اُن کے اصل الفاظ ظاہر کیے بغیر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں غلط معنی پہنائے گئے اور دونوں جگہ دو مختلف سیاسی اغراض کے لئے ان کو استعمال کیا گیا۔ حالانکہ میرا بیان اُن میں بھی غیر واضح نہ تھا۔ اب ان تصریحات کے بعد میں توقع رکھتا ہوں کہ کوئی غلط بات میری طرف منسوب کرنے کی کوشش نہ کی جائے گی۔"

یہ بیان لاہور اور کراچی کے تمام اخبارات کو بھیجا گیا تھا جن میں سے جہانِ نو کراچی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے اسے شائع کیا۔ یہ بیان ۴ ستمبر کو ریڈیو پاکستان لاہور کے ڈائرکٹر صاحب کو روانہ کیا گیا (دفتر شعبۂ تنظیم کے رجسٹر خط و کتابت کا نمبر ۲۰۸۲ ہے) اور اس کے ساتھ ان سے یہ بھی درخواست کی گئی کہ مولانا یہ چاہتے ہیں کہ اگر خود ان کو موقع دیا جائے تو وہ اپنی زبان سے معمول ریڈیو کی غلط بیانیوں کی تردید کو زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ لیکن نہ صرف یہ کہ مولانا کو اسکی اجازت نہ دی گئی بلکہ اس بیان تک کو نشر نہیں کیا گیا۔

صاف ظاہر ہے کہ اس بیان کے نشر کرنے سے چونکہ حکومت کے پروپگنڈے اور اسکی سازش کا قلع قمع ہوتا تھا اس لئے اس نے جہادِ کشمیر کو دانستہ نقصان پہنچنے دیا۔ تاکہ مولانا پر الزام لگانے کی آسانیاں برقرار رہیں۔

۵ - اس سازش کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اس خبر کے پریس میں آتے ہی پاکستان کے پورے ملکی پریس نے یک زبان ہو کر اس طرح مولانا اور جماعت اسلامی کے خلاف پروپگنڈہ کرنا شروع کر دیا جس سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہ منصوبہ طے کیا جا چکا تھا۔ کئی مہینے تک بعض اخبارات ایسے انہماک کے ساتھ یہ کارِ خیر کرتے رہے کہ گویا کشمیر کی جنگ جیتنے کے لئے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو بدنام کرنا اور ان کے خلاف لوگوں کو مشتعل کرنا بھی کوئی ضروری مرحلہ ہے۔ اخبارات کے ساتھ ساتھ حکومت پاکستان کے پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ کے کارکنوں اور سرکاری و نیم سرکاری خطیبوں اور مقرروں کی پوری فوج بھی اس پروپگنڈے میں حصہ لے رہی تھی اور سب کا مستقل طریق کار یہ تھا کہ مولانا کی کسی اصل

بات ان میں سے کسی نے بھی کبھی لوگوں کے سامنے نقل نہ کی بلکہ خود اپنی طرف سے طرح طرح کی باتیں گھڑ کر مولانا کی طرف منسوب کیں اور ان کے ذریعے عوام الناس کو ان کے خلاف بھڑکایا۔ یہاں تک کہ بعض خطیب صاحبان نے تو مسجدوں کے منبروں پر چڑھ چڑھ کر لوگوں کو مولانا کے قتل تک پر ابھارا۔ پھر یہ مہم یہیں ختم نہیں ہوگئی بلکہ اس جھوٹ اور سفید جھوٹ کو پوری طرح فروغ دینے کے لئے حکومت نے "تسنیم" اور "کوثر" کو چھ ماہ کے لئے بند کر دیا تاکہ اس پروپگنڈے کی کوئی تردید نہ کی جا سکے۔ اس کے بعد سازش کے ثبوت میں اگر کوئی کسر رہ جاتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ حکومت خود ہی ایک سرکاری اعلان کے ذریعے اس کا اعتراف فرمالے کہ ہاں اس نے یہ سازش کی تھی۔

۴۔ مولانا کی گرفتاری کے لئے فضا ابھی اسی طرح تیار کی ہی جا رہی تھی کہ ۰ ۱ ستمبر ۴۸ ۱۹ء کو حکومت پاکستان اور کشمیر کمیشن کی مراسلت شائع ہوگئی جس کے بعد مولانا کی رائے میں کشمیر کے معاملے کی شرعی پوزیشن بالکل بدل گئی تھی۔ جیسا کہ موصوف نے ۱۲ اگست کے بیان میں پیشگی یہ اعلان کیا تھا کہ:-

(۱) "اگر معاہدانہ تعلقات ختم ہو چکے ہیں یا سرے سے تھے ہی نہیں (اور حالت جنگ پیدا ہو چکی ہے) تو یہ حکومتِ پاکستان کا کام ہے کہ وہ صاف صاف اس بات کو کہے۔ اگر آج حکومت پاکستان سرکاری طور پر اس چیز کا اعلان کر دے تو میں خود اعتراف کر لوں گا کہ اب شرعی پوزیشن وہ نہیں ہے جو میں نے بیان کی تھی اور ہم جنگی کارروائی کرنے کے لئے آزاد ہیں۔"

(ب) "لیکن اس دعوے کے معاملے میں ہمارے لئے دو ہی طریق کار ہو سکتے ہیں۔ یا تو ہم مصالحانہ طریق سے باشندگان کشمیر کے اس حق کو تسلیم کرائیں اور یا کھلم کھلا اپنی فوجیں کشمیر میں اس طرح اتاریں جس طرح انڈین یونین نے جوناگڈھ میں اتاری تھیں۔ ان دونوں راہوں کے درمیان کوئی تیسری راہ دیانت اور سچائی کی راہ نہیں ہے۔"

(ج) "میں حالات کو جس طرح دیکھ رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ بالآخر کرنا یہی پڑے گا، لیکن بعد از وقت کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔" [۱]

---

[۱] یہی وہ صورت تھی جس کے تحت مولانا کھلی جنگی کارروائی پر زور دے رہے تھے، اور ہمارے لئے یہ کوئی مقام مسرت نہیں ہے کہ بدقسمتی سے یہ پیشگوئی آج حرف بحرف پوری ہو رہی ہے اور اسی اندیشے نے مولانا کو بے چین کر رکھا تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ واقعہ ۸ ستمبر ۱۹۵۰ء کا ہے کہ حکومتِ پاکستان کے وزیر خارجہ نے یہ اعلان کر دیا کہ مدافعتی مقصد کے لئے پاکستان کی فوجیں کشمیر کی سرزمین TERRITORY میں داخل ہو کر موجود ہیں۔

اس اطلاع کے ملتے ہی مورخہ ۱۸ء ۱۹ء ۲۰ ستمبر کو جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کا جو اجلاس منعقد ہوا، اس میں مسئلہ کشمیر کی نئی پوزیشن کے بارے میں شرعی احکام کی رُو سے جماعت کے طرزِ عمل کو متعین کر دیا گیا۔ ملاحظہ ہو قرارداد نمبر ۵:۔

"امیر جماعت نے اپنے پچھلے بیانات میں جو شرعی مسئلہ بیان کیا تھا وہ اس حالت سے متعلق تھا، جب کہ سرکاری طور پر اس امر کا کوئی اقرار و اظہار نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی فوجیں حدودِ کشمیر میں موجود ہیں۔ اب ۸ ستمبر کو مجلسِ اقوامِ متحدہ کے کشمیر کمیشن سے حکومت پاکستان کی جو مراسلت شائع ہوئی ہے اور وزیر خارجہ پاکستان نے ۸ ستمبر کو جو بیان دیا ہے، اس میں اس امر کا واضح اقرار و اظہار موجود ہے اور حکومتِ ہند بھی اس پر مطلع ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب چونکہ معاملے کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے اور اس بنا پر اس کا شرعی حکم بھی وہ نہیں ہوگا جو پہلے تھا۔" اس انکشاف کے بعد امیر جماعت اور مجلس شوریٰ کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اب معاہدانہ تعلقات کے باوجود اہل

بقیہ حاشیہ صفحہ متعلقہ آج کشمیر میں تقسیم کا جو نسخہ لکھوا دیا گیا ہے اسے مٹانے کے لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنی قربانیوں کی ضرورت پیش آئیگی اور یہ نتیجہ ہے ان لوگوں کی کوتاہ کاریوں کا جو جہادِ کشمیر کے بارے میں اپنا اصل فرض انجام دینے سے کنی کاٹتے رہے اور مولانا کو بدنام کرنے میں لگے رہے۔ ان لوگوں نے اپنی کوتاہیوں کی ذمہ داری مولانا پر ڈالنے کی کوشش کی۔ جب وقت تھا تو کھلی جنگ سے کترانے کیلئے یہ لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ ابھی ہماری طاقت کم ہے، دوسرے الفاظ میں عوام کا Morale گرا رہے تھے لیکن جب مجبور ہو کر کھلی جنگ کی صورت کو قبول کرنا پڑا تو یہ وہ وقت تھا جب انڈیا اپنی فوجیں کشمیر میں بڑی تعداد میں پہنچا چکا تھا، ہماری اسلحہ کی ناکہ بندی کر چکا تھا، کمیونسٹ خطرے پر قابو پا کر اور حیدرآباد سے نمٹ کر پوری طرح کشمیر کی طرف یکسو ہو چکا تھا ـــ اور اب کوئی صورت اس کے سوا باقی نہ رہی تھی کہ ہمارے لیڈر یو۔ این او کے سامنے نہایت گھٹیا شرائط پر گھٹنے ٹیک دیں اور یہ اعلان کریں کہ ہم پُرامن کے ذریعے مسئلے کو حل کرنا پسند کرتے ہیں۔ انکو اتنی عقل نہ تھی کہ اگر پاکستان کی فوجی قوت ایک خاص رفتار سے آپ بڑھا سکتے ہیں تو انڈین یونین بھی اپنی قوت کو اسی تناسب سے بڑھاتی چلی جائیگی۔ وقت وہی تھا جب مولانا نے متنبہ کیا تھا۔ وہ وقت گزار دینے کے بعد یہ مسئلہ ایک خطرناک منزل میں داخل ہو گیا ہے اور اب اسے حل کرنے کے لئے ہم لوگوں کو پہلے سے زیادہ قربانیاں دینی ہونگی اور سروسامان کی قلت و کثرت سے نگاہ ہٹا کر پہلے سے زیادہ توکل علی اللہ پر انحصار کرنا ہوگا۔

پاکستان کے لئے جہاد کشمیر میں جنگی حصہ لینا بالکل جائز ہے "

کسی دیانت دار شخص یا جماعت کا طرز عمل یہی ہو سکتا ہے کہ جونہی صحیح صورت نمودار ہو جائے وہ اسکو صحیح تسلیم کرلے ۔ چنانچہ مسئلہ کشمیر میں مولانا مودودی کا طرز عمل یہی تھا کشمیر میں فوجیں بھیجنے کا جب تک سرکاری اعلان نہیں ہوا، اس وقت تک وہ اپنے اختلاف رائے پر قائم رہے اور جب اعلان ہو گیا تو انہوں نے تسلیم کرلیا کہ اب وجہ اختلاف ختم ہو گئی۔

صرف اتنا ہی نہیں، مجلس شوریٰ نے یہ بھی صاف صاف واضح کردیا کہ :۔

" جماعت اسلامی مسلمانان کشمیر کے مصائب اور پاکستان کے لئے کشمیر کی اہمیت سے کبھی غافل نہیں تھی، اور انڈین یونین کے بیجا تسلط سے اس اسلامی خطے کو بچانا فرض سمجھتی تھی "

" اب چونکہ اس فرض کی ادائیگی میں کوئی شرعی مانع باقی نہیں رہا ہے اس لئے جماعت محض مسلمانوں کو مسئلہ بتانے پر اکتفا نہ کرے گی، بلکہ انشاءاللہ[1] خود اس جہاد میں عملی حصہ لے گی "

---

[1] چنانچہ جماعت کی مجلس شوریٰ نے اس سلسلے میں ایک نقشہ کار تیار کیا اور اس کے مطابق کام شروع کردیا گیا۔ اسی نقشہ کار کے تحت محمد عبدالجبار غازی صاحب (موجودہ امیر جماعت اسلامی) نے بحیثیت نمائندہ جماعت اسلامی آزاد کشمیر گورنمنٹ کے ذمہ دار لوگوں سے مل کر معلوم کیا کہ ان کو کس نوعیت کی امداد کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ انتظامی اور دفتری کاموں کے لئے کارکن چاہئیں یا لباس اور غذا اور صحت کے ضروری سامان اور جیپ کاریں وغیرہ درکار ہیں تو مرکز جماعت اسلامی سے ایک گشتی مراسلہ (نمبر ۴۹ - ۴۰/۴۰ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۴۸ء) جاری کیا گیا اور اس میں پوری جماعت سے اپیل کی گئی کہ ایک طرف نقد و جنس کی شکل میں مجاہدین کی اعانت کی مہم ... جائے اور دوسری طرف جو لوگ جہاد کشمیر میں حصہ لینے کے لئے تیار ہوں وہ اپنے نام پیش کریں۔ جماعت نے اپیل کے جواب میں دونوں مطالبوں پر لبیک کہی۔ جماعت کی طرف سے امداد کی عملاً پیشکش کرنے کے لئے جب نمائندہ جماعت آزاد کشمیر گورنمنٹ کے ذمہ دار لوگوں سے ملے تو ان لوگوں نے یہ کہہ کر امداد کو قبول کرنے سے انکار کردیا کہ چونکہ حکومت پاکستان نے مولانا مودودی کو گرفتار کرلیا ہے لہٰذا اب ہمارے لئے اس امداد سے فائدہ اٹھانا مشکل ہے۔ آخر جو سامان جمع تھا اسے بطور خود ایک گاڑی میں لدوا کر محاذ پر پہنچا دیا گیا اور جو نقد جمع ہوا تھا اس میں سے جماعت اسلامی نے راولپنڈی جہلم گجرات اور سیالکوٹ کے کشمیری مہاجرین کے بعض کنبوں کو وظائف دینے کا ایک نظم قائم کرلیا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ یہ کام چونکہ بلا کاری کے بغیر کئے گئے ہیں، اس وجہ سے بہت کم لوگ جماعت اسلامی کی ان خدمات کا علم رکھتے ہیں۔

۷۔ جب جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے اس فیصلے کا علم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو ہوا تو انہوں نے اس پر اظہار اطمینان کیا اور دوسرے تمام حالات کو جاننے والے لوگوں نے ایک اختلاف رائے کے صاف ہو جانے پر یہی تصور کیا کہ اب حکومت اور عوام کے لئے کوئی وجہ شکایت باقی نہیں رہی۔ درحقیقت جماعت اسلامی کی شوریٰ نے اس سرنگ کی ساری بارود آناً فاناً نکال دی جو عمائد حکومت نے چار ماہ کی شبانہ روز محنت سے بھری تھی۔

لیکن ہمارے اکابر حکومت نے محسوس کیا کہ اشتعال کی جو فضا بڑی محنت سے پیدا کی گئی تھی، پیشتر اس کے کہ اس کا غبار چھٹ جائے اور غلط فہمیاں ختم ہو جائیں، ایک آخری موقع اس بات کا باقی ہے کہ مولانا پر ہاتھ ڈالا جائے۔ چنانچہ وسط ستمبر میں مولانا مودودی اور امیر جماعت اسلامی کی طرف سے جہاد کشمیر میں شرکت کا اعلان ہوتا ہے اور حکومت مولانا کو گرفتار کرتی ہے ۴ر اکتوبر ۴۸ء کو۔ یہ واقعہ خود واضح کر دیتا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے متعلق حکومت سارا پروپیگنڈہ محض گرفتاری کے لئے کر رہی تھی۔

پھر اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ مولانا مودودی نے تو مسئلہ کشمیر میں اختلاف رائے کا اظہار کیا تھا لیکن مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے کونسا قصور کیا تھا؟ اور اگر مولانا مودودی کے رفیق ہونے کی وجہ سے اصلاحی صاحب گرفتاری کے سزاوار تھے تو آخر مولانا کے اور بھی چند چوٹی کے رفیق موجود تھے، مثلاً محمد عبدالجبار غازی صاحب، مولانا مسعود عالم ندوی صاحب، لیکن قرعہ فال اصلاحی صاحب ہی کے نام کیوں نکلا؟ یہ سوال خود پبلک کی رہنمائی اس حقیقت کی طرف کرتا ہے کہ مولانا اور ان کے رفقا کی گرفتاری کے لئے مسئلہ کشمیر کو محض ایک بہانہ بنایا گیا تھا، ورنہ اصل سوال یہ تھا ہی نہیں۔ اصل سوال صرف مطالبۂ نظام اسلامی پیش کرنے کے جرم کا تھا جس سے ہمارے لیڈر چڑے ہوئے تھے۔

۸۔ مسئلہ کشمیر کا جو قلعہ جماعت اسلامی پر حملہ کرنے کے لئے بڑی محنتوں سے تعمیر کیا گیا تھا، اسے جماعت اسلامی نے کھنڈروں میں تبدیل کر کے دکھا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے پہلی مرتبہ مولانا مودودی اور ان کے رفقا کی گرفتاری کے موقع پر اور نہ ان کی نظر بندی کی میعاد میں اضافہ کرتے وقت مسئلہ کشمیر کا حوالہ دینے کی کبھی جسارت نہیں کی۔

(د) مسئلہ کشمیر کا قلعہ ٹوٹتے دیکھ کر حکومت نے نئے مورچوں میں پناہ لینے کی کوشش کی، لیکن یہ مورچے اس سے بھی زیادہ بودے ثابت ہوئے۔ مثلاً یہ الزام تراشا گیا کہ مولانا اور ان کے رفقا لوگوں کو فوجی بھرتی سے روک کر پاکستان کے دفاع کو کمزور کر رہے ہیں اور ملازمین حکومت کو حلفِ وفاداری لینے سے باز رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ذلیل پروپیگنڈے کی ایک نئی شکل تھی۔ اس سلسلے کے واقعات کی اصل شکل یہ تھی:۔

۱۔ ایک مرتبہ مولانا مودودی صاحب سے ایک پرائیویٹ صحبت میں جماعت کے کچھ لوگوں نے سوال کیا کہ ہم نیشنل گارڈ میں بھرتی ہوں یا نہ ہوں؟ مولانا نے ان سے کہا کہ سردست آپ نیشنل گارڈ کے بجائے ہوم گارڈ میں شامل ہو کر ٹریننگ لیں۔ پھر اگر خدانخواستہ کسی وقت ملک کو کوئی خطرہ پیش آ گیا تو نیشنل گارڈ میں باقاعدہ فوج میں بھرتی ہو جائیے گا۔ انہوں نے اسکی وجہ پوچھی تو مولانا نے کہا کہ نیشنل گارڈ پاکستان کی فوج کا ایک حصہ ہے اور فوج کے بارے میں قیام پاکستان سے پہلے تو ہمارا صاف اور صریح مسلک یہ تھا جسے ہم نے کبھی کسی سے نہ چھپایا اور نہ اسکی تبلیغ کرنے میں دریغ کیا کہ اسکی ملازمت اور اس کے ساتھ تعاون قطعی حرام ہے، مگر پاکستان بن جانے کے بعد دستوری حیثیت سے اکابر ملک نے گومگو کی جو کیفیت پیدا کر رکھی ہے اسکی وجہ سے کچھ ایسی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے کہ اب نہ تو ہم کسی کو فوج میں شامل ہونے سے روک سکتے ہیں اور نہ شامل ہونے کا مشورہ دے سکتے ہیں۔ روک اس لئے نہیں سکتے کہ ہم اس ریاست کو اسلامی ریاست بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ یہ ضرور ایک دن اسلامی ریاست میں تبدیل ہو کے رہے گی۔ پھر کس طرح ہم یہ گوارا کر سکتے ہیں کہ ایک ہونے والی اسلامی ریاست کا دفاع کمزور ہو جائے۔ مشورہ ہم اس لئے نہیں دے سکتے کہ ابھی تک پاکستان کا آئین وہی ہے جو انگریزی حکومت کا تھا اور وہ کم سے کم دستوری شرائط پوری نہیں کی گئیں جو ایک ریاست کو اسلامی بناتی ہیں۔ پھر ہم یہ جرأت کیسے کر سکتے ہیں کہ ابھی سے فوج کو اسلامی فوج قرار دے دیں اور لوگوں کو فتویٰ دے دیں کہ اپنے آپ کو اس فوج کے نظم میں دے دیں جو خدا اور رسول کی حدود کی پابندی کا اقرار ابھی تک نہیں کر چکی۔ اس بنا پر میں یہ کہتا ہوں کہ سردست آپ لوگ صرف اتنے پر اکتفا کریں کہ فوجی ٹریننگ لے کر اپنے آپ کو ملک کی مدافعت کے لئے تیار کر لیں۔ آگے چل کر اگر خدانخواستہ کسی وقت ملک پر کوئی حملہ ہو جائے تو اضطرار EMERGENCY کی حالت پیدا ہو جائے گی اور آپ کے لئے شرعاً جائز ہو جائے گا کہ اپنی جان، مال، اور

اپنے ملک کو اسلام کے لئے بچانے کی خاطر فوج میں شامل ہو کر جدوجہد کریں۔ یہ ایک ایسا مسلک تھا کہ نہ اسلام کی کوئی خلاف ورزی ہوتی تھی اور نہ پاکستان کے دفاع کی تیاریوں میں کوتاہی ہو سکتی تھی۔ (یہ پابندی بھی شوریٰ کے ۱۰ راپریل ۱۹۴۸ء کے فیصلے کے مطابق صرف ارکان جماعت کے لئے تھی)

۲۔ یہی سوال کسی صاحب نے بذریعہ خط دفتر سے پوچھا اور قیم جماعت نے مذکورہ بالا گفتگو کی روشنی میں اس کا سیدھا صاف جواب دے دیا کہ ملکی دفاع کی تیاری ہوم گارڈ کے نظام کے تحت کریں اور اگر خدانخواستہ کوئی موقع پیدا ہو جائے تو پھر دفاع کے لئے نیشنل گارڈ یا فوج سے تعاون کر لیں۔ لیکن سردست نیشنل گارڈ کی شرکت کا مشورہ دینے سے ہم معذور ہیں۔

۳۔ اس خط کا حوالہ اخبارات میں دے کر حکومت کے کارکنوں نے گویا جماعت کے خلاف دوسری مہم شروع کی، لیکن جب دوسرے امیر جماعت محمد عبدالجبار غازی صاحب کی طرف سے اس سلسلے میں جوابی بیان شائع ہوا تو اس وقت حکومت پر واضح ہوا کہ اس کا موقف کمزور ہے۔ اس بیان میں یہ باتیں واضح کر دی گئیں کہ:-

(ا) ہمارے نزدیک پاکستان کے دفاع کی حیثیت وہی ہے جو اس قطعۂ زمین کی حفاظت کی ہوتی ہے جو مسجد بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہو۔

(ب) ہم عام مسلمانوں کو دفاعی تیاریوں میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے کی ترغیب دے رہے ہیں جس کے لئے جماعت کی شوریٰ نے تمیز کی قرارداد " اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے)

(ج) جہاں تک عام مسلمانوں کے فوج میں بھرتی ہونے نہ ہونے کا سوال ہے، اس کا فیصلہ ہم ان کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کو فوجی بھرتی سے تحریراً یا تقریراً روکنے کے لئے کوئی مہم ہماری طرف سے کبھی شروع نہیں کی گئی۔

(د) ارکان جماعت کے لئے ہماری ہدایت یہ ہے کہ وہ اپنی توجہات کو اصلاً اقامتِ دین کی جدوجہد پر مرتکز رکھتے ہوئے دفاع کے مختلف کاموں کی تربیت حاصل کرنے میں پورا پورا حصہ لیں۔

(س) عملاً دفاع کی ضرورت پیش آجانے پر ارکان کو بھی بہر حال فوج کے اندر شامل ہو کر یہی فرض ادا کرنا ہوگا۔

(۳) لیکن فوج میں تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے ان کو شمولیت کا مشورہ ہم صرف اسی صورت میں دے سکتے ہیں جب کہ حکومت ریاست اور فوج کے اسلامی ہونے کا دستوری اعلان کرکے گومگو کی موجودہ حالت کو ختم کردے، اور ہماری کوشش یہ ہے کہ ایسا اعلان جلد از جلد ہو تاکہ حکومت کی سرگرمیوں سے پورا پورا تعاون کرنے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ ختم ہو جائیں۔

۴۔ اس تصریح سے حکومت ایسی بوکھلا اٹھی کہ اس نے امیر جماعت کے جوابی بیان بعنوان "جماعت اسلامی اور دفاع پاکستان" کو ضبط کرلیا۔

۵۔ اس کے بعد دوبارہ حکومت کو اس مسئلے کے چھیڑنے کی کبھی جرأت نہیں ہوئی۔

۶۔ رہا حلفِ وفاداری کا مسئلہ، سو اس کی حقیقت یہ تھی کہ صوبہ مغربی پنجاب کی حکومت نے خواہ مخواہ کی ایک اُپج اختیار کی کہ ہر سرکاری ملازم سے پاکستان اور دستورِ پاکستان کی غیر مشروط وفاداری کا حلف لیا جائے۔ اس حرکت کی مثال دنیا کے اور کسی گوشے میں نہیں پائی جاتی اور نہ دستوری طور پر یہ کوئی جائز اور معقول اقدام تھا لیکن جب حماقت سے ایک مسئلہ پیدا کردیا گیا تو بیدار ضمیر ملازمین نے مولانا مودودی صاحب سے اس حلف کی شرعی پوزیشن کے بارے میں سوال کرنا شروع کئے۔ ان سوالات کا جواب ترجمان القرآن میں دیا گیا اور حسب ذیل امور مولانا نے پورے دلائل کے ساتھ واضح کردیئے۔

(ا) خدا کے سوا اور کسی کی غیر مشروط وفاداری کا حلف لینا مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے۔ مخلوق کی وفاداری و اطاعت صرف "معروف" کی حد تک ہو سکتی ہے۔

(ب) پاکستان کی خیر خواہی کا حلف لینا جائز ہے لیکن موجودہ دستور یعنی ایکٹ ۱۹۳۵ء کی وفاداری کا اقرار کرنے کے نہ کوئی معنی ہیں اور نہ انگریز کے بنائے ہوئے ایک کافرانہ دستور کے بارے میں ایسا اقرار کرنا جائز ہی ہے۔

(ج) آئندہ بننے والے دستور کے لئے وفاداری کا پیمان اسی شرط سے مشروط کرکے استوار کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف نہ ہو۔

(د) ایسے حلف کو جبراً لینے کی صورت میں حکومت اپنے دیانتدار ترین کارکنوں سے جو جھوٹا حلف

لینے پر تیار نہ ہوسکیں گے ، محروم ہوجائے گی اور اس حلف کو وہی لوگ گوارا کریں گے جن کے نزدیک اس کا کوئی سوال ہی نہیں کہ کیا حلف لیا جارہا ہے اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہوسکتی ہیں۔

۷۔ اس حقیقت کو مولانا مودودی نے ایک ملاقات میں پاکستان کے وزیر داخلہ اور مغربی پنجاب کے وزیر اعظم کے سامنے جب واضح کیا تو ان کی آنکھیں کھلیں۔ چنانچہ بعد میں اس لغو کارروائی کو روک دیا گیا۔

۸۔ اس کے بعد حلف وفاداری کا مورچہ بھی ختم ہوگیا۔

(۶) جماعت اسلامی حکومت سے بہانوں اور حیلوں کے سارے ہتھیار ایک ایک کرکے چھین چکی تھی، لیکن حکومت کے ملازمین اور دوسرے اقتدار پرست لوگ در پردہ اپنے حلقوں میں انہیں بے معنی حیلوں حوالوں کا پروپگنڈہ کرنے میں مصروف تھے اسی دوران میں حکومت قراردادِ مقاصد کو پاس کرنے پر مجبور ہوگئی جس نے جماعت اسلامی کی پوزیشن کو اور زیادہ مضبوط کردیا۔

(۷) واقعات یوں ہیں کہ جماعت اسلامی کے اہم ترین کارکنوں کو نظر بند کرکے حکومت اپنی جگہ مطمئن ہوگئی تھی کہ اب مطالبہ نظام اسلامی کی مہم کا زور ہم نے توڑ دیا ہے اور جماعت اسلامی کی تحریک کے پھلنے کی ہوا ہم نے نکال دی ہے۔ یہاں تک کہ گرفتاری کے دو ماہ بعد دسمبر ۱۹۴۸ء میں در پردہ یہ اسکیم بن چکی تھی کہ پاکستان کے ایک لادین (SECULAR) ریاست ہونے کا اعلان کردیا جائے۔ لیکن ان حضرات کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ جماعت اسلامی کی تحریک ایک فرد کا مظاہرۂ شخصیت (ONE MAN SHOW) نہ تھی، بلکہ مودودی صاحب کی گرفتاری کے بعد جماعت کا نظم پہلے کی طرح مضبوطی سے کام کرتا رہا اور اس کی سرگرمیوں نے ثابت کردیا کہ مولانا مودودی اپنی جگہ کام کرنے کے لئے جن کارکنوں کو چھوڑ گئے ہیں ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت قابلِ اعتماد حد تک ہوچکی ہے۔ چنانچہ دسمبر تک کارکنانِ جماعت نے زہر آلود فضا کو اتنا صاف کرلیا کہ مطالبہ دوبارہ چمک اٹھا اور اکابرِ حکومت اپنے پروگرام میں تامل کرنے پر مجبور ہوگئے۔ پھر جماعت نے فروری ۱۹۴۹ء تک مطالبے کا تیسرا ریلا اس زور سے اٹھایا کہ مارچ ۱۹۴۹ء میں حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے اور نہایت شرافت سے قراردادِ مقاصد پاس کرکے مطالبے کے جوہر کو دستوری حیثیت سے تسلیم کرلیا۔

یہ ایک عجیب سیاسی لطیفہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے ایوان میں جس شخص کے مطالبے کے جواب میں قراردادِ مقاصد

پاس کی جارہی تھی، اسے بدستور جیل میں بند رکھا گیا تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ اتنے بڑے لیڈر اس نوخیز مردِ مجاہد سے شکست کھا گئے ہیں، جس سے شکست کھائی جارہی تھی اسکی نظر بندی میں اضافہ کی تجویزیں محض اس انتقام کے لئے کی جارہی تھیں کہ تو نے فتح کیوں حاصل کر لی ہے؟

(۸) قراردادِ مقاصد کا پورا پورا تجزیہ کرنے کے بعد جب جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کو اطمینان ہوگیا کہ اس میں مطالبہ کا جوہر تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس میں وہ اصول آگئے ہیں جن کو ایک اسلامی دستور کے لئے بنیاد بنایا جاسکتا ہے تو اس نے دیانتدارانہ طریق سے اسے قبول کر لیا۔ اس سلسلے میں مجلس شوریٰ نے ایک ابتدائی بیان مورخہ ۱۳ مارچ کو جاری کیا اور پھر تفصیلات کو واضح کرنے کے لئے اور اپنے دستور میں ترمیم کرنے کے لئے اس نے اپنے دوسرے اجلاس منعقدہ ۵، ۶، ۷، ۸ اپریل ۱۹۴۹ء کی قراردادوں میں یہ تصریحات کر دیں:-

(۱) قراردادِ مقاصد کے بعد جب ہماری ریاست اپنی دستوری زبان کے ذریعے اس بات کا اقرار کر چکی ہے کہ حاکمیت اللہ کے لیے ہے، اور ریاست کا پبلک لاء جمہوریت، آزادی، معاشرتی انصاف، اور رواداری کے اُن اصولوں پر مبنی ہوگا جو اسلام نے مقرر کئے ہیں، اور ریاست کا کام یہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق منظم کریں، تو اس قرارداد کے بعد یہ ریاست اصولاً ایک اسلامی ریاست بن چکی ہے؛ اور اس کے بعد وہ دستوری روکاوٹیں از خود ختم ہوگئی ہیں جو سابق کافرانہ نظام میں شریعت کی طرف سے ہم پر عاید ہوتی تھیں۔

(ب) تمام سرکاری ملازمتیں جائز ہوگئی ہیں۔ ملازمین رکن جماعت بن سکتے ہیں۔

(ج) جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے موجودہ عدالتوں میں مقدمات لے جانے کی رخصت حاصل ہوگئی ہے۔

(د) اسمبلیوں کی رکنیت اور انتخابات میں حصہ لینا بھی جائز ہوگیا ہے۔

(۲) اب ہر مومن کا فرض ہے کہ اپنے دل و دماغ کی تمام قابلیتیں اور اپنے تمام ذرائع و وسائل اس ریاست کو محفوظ و مستحکم بنانے، اسے ترقی دینے اور اسے شکل و روح کے اعتبار سے ایک مکمل

اسلامی ریاست بنانے کی کوشش میں صرف کردے اور جس شکل اور جس حیثیت میں بھی وہ اس کی کوئی خدمت انجام دے سکتا ہو، بہ دل و جان انجام دے۔

(۳) مذکورہ بالا تغیر کے بعد جماعت کی پالیسی میں جو تغیر آپ سے آپ ہو گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اب ریاست سے ہمارا معاملہ ایجابی طور پر (POSITIVELY) وفادارانہ ہے۔ عدم تعاون کا رویہ ختم ہو گیا ہے۔ اب ہم باہر ہی سے نہیں، بلکہ اندر سے بھی اصلاح و ترقی کی پوری پوری کوشش کریں گے۔

یہ وہ فیصلہ تھا جس نے حکومت کے تمام مُہروں کو ایک ہی داؤں میں مات دے دی۔ اور وہ اپنی جگہ بالکل بے بس ہو کے رہ گئے، ورنہ درحقیقت ارادے یہ تھے کہ قراردادِ مقاصد کو مضبوط مورچہ بنا کر جماعت اسلامی پر شدید ترحملہ کیا جائے۔

(۹) قراردادِ مقاصد کے سامنے آنے اور جماعت اسلامی کی طرف سے اس کے فراخدلانہ خیر مقدم ہونے کے فوراً بعد ملک بھر میں یہ آواز بلند ہونے لگی کہ اب آخر حکومت کے پاس مولانا کی نظر بندی کے لئے کیا وجہ جواز باقی ہے، چنانچہ جابجا مختلف جماعتوں کے جلسوں میں ریزولیوشن پاس ہوئے، مختلف لیڈروں اور علماء اور خصوصاً مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے مولانا کی نظر بندی کے جاری رہنے کے خلاف بیانات دیئے اور پبلک میں ایک عام اضطراب کی لہر اٹھنا شروع ہو گئی۔ ہمارے لیڈر اگر ملک و ملت کے بہی خواہ اور مولانا مودودی سے اختلاف کرنے میں مخلص ہوتے تو وہ قراردادِ مقاصد بعد میں پاس کرتے اور ان کی رہائی کے احکام پہلے جاری کرتے۔ لیکن ان حضرات کو چونکہ اپنی لیڈری کے لئے مولانا کی طرف سے مستقل خطرہ محسوس ہو رہا تھا، اس لئے سارے اختلافات کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ان کو سوجھی تو نظر بندی میں اضافے ہی کی سوجھی۔ یہ دوسرا ششماہی اضافہ (مورخہ ۴ ر اپریل ۴۹ ۱۹ء تا ۳ ر اکتوبر ۴۹ ۱۹ء) ان لوگوں کے عزائم کو اور ان کے مخاصمانہ جذبات کی اصل بنا کو بالکل نمایاں کر چکا ہے۔

(۱۰) یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ قراردادِ مقاصد کے بعد اپریل میں مولانا مودودی اور ان کے رفقا کی نظر بندی میں جو اضافہ فرمایا گیا ہے، اس کے بارے میں کوئی سرکاری بیان منظرِ عام پر نہیں آیا اور یہ اس بات کا ثبوت

تھا کہ جیلوں اور بہانوں کے تھیلے خالی ہو چکے اور اب حکومت کے پاس نظر بندانِ جماعت اسلامی کے خلاف ایک حرف بھی کہنے کو باقی نہیں رہا۔ ۴ اپریل ۱۹۴۹ء کے موقف پر کھڑے ہو کر جب ایک سوچنے سمجھنے والا آدمی فروری ۱۹۴۸ء سے اپریل ۱۹۴۹ء کی تاریخ پر نظر ڈالتا ہے تو وہ مسئلہ کشمیر، مسئلۂ دفاع اور حلف وفاداری کے مسئلے کی اصل حقیقت اور ان کے پروپگنڈے کے اصل مقصد کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔ یہ تاریخ اس کو اس بات کی شہادت بہم پہنچاتی ہے کہ نظر بندی ملک و ملت کے مفاد کے لئے نہیں، بلکہ اپنی لیڈری کو بچانے کی خاطر عمل میں لائی گئی تھی۔

(۱۱) اس کے بعد چھ مہینے مزید گذر تے ہیں اور ساری پبلک یہ امید لگائے بیٹھی ہے کہ حکومت اپنی حماقت کا تسلسل اب تو ختم کر دیگی اور مولانا مودودی کی رہائی یقینی ہے۔ لیکن عوام الناس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی، جب حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ مولانا مودودی اور ان کے رفقا کی نظر بندی میں مزید چھ ماہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ تازہ اضافہ پھر اسی بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ سارا تشدد محض اس لئے ہو رہا ہے کہ:۔

(الف) مولانا ممدوح اور ان کے ساتھیوں سے اس بات کا انتقام لیا جائے کہ انہوں نے کیوں ایسے حالات پیدا کئے جن میں ان حضرات کو قراردادِ مقاصد کے پاس کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

(ب) جس قراردادِ مقاصد کو انہوں نے مجبوراً مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے پاس کر دیا ہے، اسکو محض دھوکے کی ٹٹی کے طور پر استعمال کرنے کے امکانات پیدا کئے جا سکیں، اور اس کے پردے میں اسلام کی ایک من مانی تعبیر کر کے اسے زبردستی نافذ کر دیا جائے اور ملک میں کوئی ایسا شخص موجود نہ رہے جو ان لوگوں کے مصنوعی اسلام کا پردہ چاک کر سکے۔ کچھ لوگوں کو قید کر کے ان کی زبان بندی کر دی گئی، اور کچھ دوسرے لوگوں کو وہ اس قید کے ذریعہ سے گویا کنایۃً دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر وہ ان کی حرکات پر حرف زنی کریں گے تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو فلاں اور فلاں کا ہو چکا ہے۔ چنانچہ سردار عبدالرب نشتر ایک غیر مسلم رکن اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات مولانا مودودی کے بارے میں بطور فخر اور بعض لوگوں کے لئے دھمکی کے طور پر کہہ چکے ہیں کہ

HE IS IN JAIL

اور پھر یہ واقعہ بھی کچھ پرانا نہیں ہوا کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو کراچی کے نیم سرکاری اخبار نے یہ تلقین دی کہ آپ اپنے متعلق حسنِ ظن کو نقصان نہ پہنچائیں یعنی حکومت کی کسی نامعقول سے نامعقول حرکت پر بھی کوئی جائز سے جائز اعتراض بھی مت کیجئے۔

(ج) جماعت اسلامی نے انقلابِ قیادت کا جو فیصلہ کیا ہے اور اس مقصد کے لئے صوبہ مغربی پنجاب (اور اس کے بعد پاکستان کے دوسرے صوبوں) کے ہونے والے انتخابات میں عملی حصہ لینے کا جو اعلان اس کی طرف سے ہو چکا ہے، اس کے پیشِ نظر مولانا اور ان کے ساتھیوں کو نظر بند رکھ کر ایک پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ میں انتخابات کرانے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ حکومت کو یہ معلوم ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور ان کے رفقا کی جس دن رہائی ہوئی اس دن پبلک —— جو لیگ کی لیڈر شپ سے بیزار اور اس کی انتشار پذیر تنظیم سے ٹوٹ رہی ہے —— تیزی سے جماعت اسلامی کے گرد سمٹنے لگے گی اور حکومت کے پروپیگنڈے کے تمام جال جواب پرزے پرزے ہو چکے ہیں اس کا راستہ روک نہ سکیں گے۔ اس احساس کے تحت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ نظر بندانِ جماعت اسلامی کو ابھی اور کچھ مدت جیل میں رکھا جائے۔

(۱۲) حکومت پاکستان نے پبلک کے اضطراب کو دیکھ کر اور اس میں اضافہ ہو جانے کے اندیشے کو محسوس کرتے ہوئے اب کی مرتبہ مولانا کی نظر بندی میں اضافہ کے حکم کو جائز ثابت کرنے کے لئے بیان دینا ناگزیر سمجھا ہے لیکن تعجب یہ بیان پوچ اور لچر قسم کا ہے اور اس میں جس مغربی ڈپلومیسی کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس نے ہمارے لیڈروں کی ذہنیت کو اور زیادہ بے نقاب کر دیا ہے۔ اس بیان کے نشر کرنے والوں نے دیانتداری سے کام لینے کے بجائے غلط فہمی پیدا کرنے کے لئے یہ طرز اختیار کیا ہے کہ اولاً سیفٹی ایکٹ کو جاری رکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ سیاسی سازشوں اور سازش کرنے والوں کی سرگرمیوں کی روک تھام کے لئے چونکہ کوئی قانون موجود نہیں ہے، لہٰذا حکومت اسے برقرار رکھنے پر مجبور ہے، اس کے بعد مولانا اور ان کے رفقا کی نظر بندی کو جاری رکھنے کے جواز میں یہ بات کہی ہے کہ حکومت بڑی احتیاط سے سوچ سمجھ کر سیفٹی ایکٹ کو صرف ان لوگوں کے خلاف استعمال کر رہی ہے جن کے متعلق واقعی شبہات ہیں۔ اس ساحرانہ طرزِ بیان سے گویا ایچ پیچ کے ساتھ مولانا مودودی اور ان کے رفقا

کے متعلق یہ ظاہر کرنے کی ممکنہ کوشش کی گئی ہے کہ یہ حضرات بھی جاسوسی اور سازش کے الزامات ہی کے مورد ہیں۔ اس بیان پر حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب حکومت کے پاس نہیں ہے

(ا) پبلک سیفٹی ایکٹ تو انگریزی حکومت نے زمانۂ جنگ میں بنایا تھا، اور اس سے پہلے بہرحال جاسوسی اور بغاوت کے جرائم کے لئے عام ملکی قانون ہی کے تحت کارروائیاں کی جاتی تھیں۔ کیوں نہیں اُن قوانین کو استعمال کیا جاتا؟

(ب) اگر ملکی قانون جاسوسی اور سازش کے جرائم کی روک تھام کے لئے ناکافی ہے تو کیا وجہ ہے کہ کوئی نیا قانون نہیں بنا لیا جاتا اور کوئی آرڈیننس نافذ نہیں کر لیا جاتا؟ قانون کے موجود نہ ہونے سے یہ کیسے جائز ہو گیا کہ لاقانونی کو قانون قرار دے لیا جائے۔

(ج) کیا وجہ ہے کہ حکومت نے مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں اس بات کی کوئی صراحت نہیں کر دی کہ ان کے بارے میں فلاں فلاں الزامات لگانے کے لئے قوی شبہات ہیں؟

(د) شبہات ہی شبہات ہیں ان حضرات کی نظر بندی کو ایک سال ہو چکا ہے اور اب چھ ماہ کا اور اضافہ کیا گیا ہے، لیکن کیا حکومت بتا سکتی ہے کہ اس کی سی آئی ڈی کو اور اس کے محکمۂ سنسر کو گہری جستجو کے باوجود کوئی دستاویز، کوئی تحریر، کوئی شہادت اپنے شبہات کے حق میں بہم پہنچی ہے؟ جب ایک سال میں کچھ نہیں ملا تو کیا دس سال تک ان کو محض اس لئے نظر بند رکھا جائے گا کہ ابھی تک شبہات کے لئے ثبوت نہیں ملے!

(۳) اگر کسی طرح کے الزامات کے لئے حکومت دلائل بھی رکھتی ہے اور وہ دلائل اخباری بیان میں سامنے نہیں لائے جا سکتے تو کیوں نہ ان کو کھلی عدالت کے سامنے رکھ دیا جائے اور اگر کھلی عدالت سے اندیشہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ کسی بند کمرے میں سماعت مقدمہ کا انتظام نہ کر لیا جائے؟

(۴) مذکورۂ بالا بیان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سیفٹی ایکٹ کا جتنا استعمال انڈین یونین کے صوبہ مدراس اور مشرقی پنجاب میں ہو رہا ہے، اس کے مقابلے میں ہمارے صوبہ مغربی پنجاب میں بہت ہی کم استعمال کیا جا رہا ہے مغربی پنجاب میں اس وقت صرف چھ سیاسی افراد نظر بند ہیں۔ اس منطق کے تحت تو ہزاروں نظر بندی موجود ہوں

تو بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہٹلر اور اسٹالن کے مقابلے میں تو ہم کم زیادتیاں کر رہے ہیں۔ سوال نظر بندوں کی تعداد کا نہیں، بلکہ اگر ایک نظر بند کو بھی اسلام کے تصورِ انصاف کے خلاف خدا کے دیئے ہوئے حقوقِ آزادی سے محروم کیا گیا ہے تو پھر یہ سمجھنا چاہیئے کہ پورا ملک نظر بند ہے اور پوری ملت کی آزادی خطرے میں ہے۔ یہ کہنا کہ ہم بڑی احتیاط سے سیفٹی ایکٹ کو استعمال کر رہے ہیں، صرف اس صورت میں کوئی معنی رکھتا ہے جب کہ معاملات باقاعدہ عدالت میں آئیں، الزامات پر بحث ہو، شہادتیں پیش ہوں اور ملزمین کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعے واضح ہو سکتا ہے کہ سیفٹی ایکٹ کا کونسا استعمال محتاط تھا اور کونسا غیر محتاط۔ لیکن جب الزام لگانے والی بھی حکومت ہو، شہادتوں کا جائزہ لینے والی بھی حکومت ہو، فیصلہ کرنے والی بھی حکومت ہو، اور پبلک کی نگاہوں سے تمام حالات مخفی رکھے جا رہے ہوں تو اس صورت میں محتاط اور غیر محتاط استعمال میں کون فرق کر سکتا ہے۔ سیفٹی ایکٹ کے لئے محتاط استعمال کی اصطلاح استعمال کرنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی قصاب بکری کے گلے پر چھری پھیرتے ہوئے یہ کہے کہ چھری کا استعمال سوچ سمجھ کر محتاط طریق سے کیا جا رہا ہے۔

حکومت کے اس بیان نے جو اس نے نظر بندانِ جماعت اسلامی کی میعاد نظر بندی میں اضافہ کرتے ہوئے نشر کیا ہے، ہمارے ملک کے لیڈروں کے منطقی افلاس اور اخلاقی دیوالیہ پن کو بالکل الم نشرح کر دیا ہے۔ اب یہ لوگ کھلم کھلا انتقامی روش کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے پبلک کا مفاد نہیں بلکہ اپنا مفاد ہے اور اپنے ہی مفاد کے لئے انہوں نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں غلط پروپیگنڈہ کیا، اپنے ہی مفاد کے لئے انہوں نے دوسرے شوشے چھوڑے، اور اپنے ہی مفاد کے لئے یہ مولانا مودودی اور ان کے رفقاء کی میعاد نظر بندی میں بار بار اضافے کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ان حضرات کو نہ اسکی پروا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی جیسا عالمِ دین جو باقاعدہ اپنی سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے جماعت اسلامی کے اکابر کی نظر بندی کو ناروا قرار دے چکے ہیں، نہ انہیں اسکی پروا ہے کہ ملک کی تمام اسلام دوست اور آزادی پسند جماعتیں اور دیانت دار اور دلیر لیڈر اس نظر بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر چکے ہیں، نہ انہیں اسکی پروا ہے کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر اور قصبے کی اکثر مساجد سے ایسے ریزولیوشن بار بار پاس

ہو چکے ہیں جن میں اس نظر بندی کو ظلم قرار دے کر نظر بندوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے، نہ انہیں اسکی پرواہ ہے، کہ جماعت اسلامی کے زیر اہتمام بڑے اور چھوٹے مقام پر کئی کئی بار جلسہ ہائے عام میں اس نظر بندی کے ناجائز ہونے کے بارے میں حکام کو متنبہ کیا جا چکا ہے نہ ان کو اسکی پرواہ ہے کہ ملک کے گوشے گوشے سے ہزارہا تار، محضر نامے، خطوط اور مراسلے مولانا مودودی اور ان کے رفقا کی رہائی کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومت کے دفاتر میں موصول ہو رہے ہیں، نہ ان کو اسکی پرواہ ہے کہ لاہور، کراچی اور دوسرے مقامات کے جرائد نے بالاتفاق حکومت کی روش کو غلط قرار دیا ہے اور ہمارے نظر بندوں کی رہائی پر زور دیا ہے۔

رائے عام کے جذبات کا اظہار جتنے مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے، مولانا مودودی اور ان کے رفقا کی رہائی کے لئے برابر ہو رہا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری پبلک یہ کہتی ہے کہ اسکی سیفٹی کو نظر بندانِ جماعت اسلامی سے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ وہ ان کی خدمات کی ضرورتمند ہے۔ آخر وہ پبلک کونسی ہے اور کہاں رہتی ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ اسکی سیفٹی کو مولانا مودودی اور ان کے رفقا سے خطرہ ہے اور جس کا حوالہ دے کر ہمارے ملک کے لیڈر پبلک سیفٹی ایکٹ کا مکروہ ترین استعمال فرما رہے ہیں۔ کہیں پبلک کے لفظ سے ملک کے چند وزرا اور گورنر صاحبان ہی تو مراد نہیں ہیں، جن کی لیڈری کی سیفٹی خطرے میں مبتلا ہے۔

اگر صورتِ واقعہ یہی ہے ــــــ اور حالات گواہی دے رہے ہیں کہ یہی ہے تو یہ خطرہ مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کو جیل میں رکھنے سے روز افزوں ہوتا جائے گا، اور جس دن بھی ان کی رہائی ہوگی اس دن ملک کی توجہات کا مرجع انشاء اللہ وہی ہوں گے۔ کیونکہ ملت نظامِ اسلامی کے قیام کا فیصلہ کر چکی ہے اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، میاں طفیل محمد صاحب اور ان کے ہم مسلک رفقا کی خدمات سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ ان حضرات کا مقام جیل میں نہیں، بلکہ میدانِ عمل ہے۔ دیر یا سویر انہی حضرات کے ہاتھوں سے اس ملک میں نظامِ اسلامی کا سنگِ بنیاد رکھا جانا ہے اور اس مقصد کے لئے ملت کو پوری جدوجہد کرنی ہوگی کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی "امانت" کو ملتان جیل سے واپس حاصل کرے۔ وبید اللہ التوفیق؛

مطبوعات

حیات نو (ہفت روزہ)
اشتراکیت نمبر

بہ ادارت :- محمود فاروقی صاحب
مقام اشاعت :- حیدر آباد، دکن
چندہ سالانہ :- درج نہیں۔ قیمت اشتراکیت نمبر فی پرچہ ۵/

ریاست دکن (انڈیا) کے اخبارات میں سے حیات نو اسلامی نظام حیات کا داعی ہے۔ حیات نو کا اشتراکیت نمبر جو ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، ہمارے سامنے ہے۔ یہ نمبر دراصل اس کشمکش کے زیر اثر شائع کیا گیا ہے جو برعظیم ہند میں بالعموم اور ریاست حیدر آباد کے ماحول میں بالخصوص، سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان رہتا ہے! اور جس سے اسلام بہرحال بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ اس نمبر میں "کمیونسٹ پروپگنڈے کی ریشہ دوانیاں" "اشتراکیت اور اشتمالیت کا نقطۂ آغاز" "مارکس کا نفسیاتی تجزیہ" اور "کمیونزم اقبال کی نظر میں" قابل قدر مضامین شامل ہیں۔ صوری محاسن خصوصاً کاغذ اور کتابت کا معیار اور زیادہ بلند ہونا چاہیئے۔

ماہنامہ فاران

بہ ادارت :- جناب ماہر القادری صاحب
مقام اشاعت :- کیمبل اسٹریٹ کراچی
چندہ سالانہ :- چھ روپے (فی کاپی ۸/)

تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں جو نئے ادبی ماہنامے اشاعت پذیر ہونے لگے ہیں ان میں سے چند اچھے رسالوں کی صف میں فاران کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ماہر القادری صاحب شعر و افسانہ کے میدان میں ایک معیاری حیثیت رکھتے ہیں اور آپ کی نگارشات میں جہاں ایک طرف ندرت و لطافت ہوتی ہے وہاں دوسری طرف فنی اہتمام بھی پورا پورا موجود ہوتا ہے۔ ماہر صاحب نہ صرف یہ کہ موجودہ ترقی پسند ادیبوں کی بنائی ہوئی لکیر کی فقیری کرنے پر کسی طرح راضی ہونے والے نہیں ہیں، بلکہ چند بے راہ رو (ترقی پسند) ادیبوں کے ادبی فاشزم کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے تعمیر پسند ادب کی ایک نئی شاہ راہ بنانے

میں مصروف ہیں۔ آپ نے اپنے مخصوص تعمیری ادبی نقطۂ نظر کو فروغ دینے، ادب کو اسلام کی خدمت کے لئے تیار کرنے اور اپنے ہم خیال اہل قلم کو منظم کرنے کے لئے "فاران" کا اجرا کیا ہے۔ ان مقاصد کے پیش نظر ہم اس نوخیز ماہنامے کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ اب تک اس کے جو پانچ چھ نمبر ہماری نگاہ سے گذرے ہیں وہ بہت ہی حوصلہ افزا ہیں۔

ماہنامہ یثرب	زیر ادارت :- بشیر احمد صاحب ارشد مقام اشاعت :- نزد تھانہ گوالمنڈی۔ لاہور

چندہ سالانہ :- پانچ روپے فی پرچہ ۸ ر

یہ نواجرا ماہنامہ اسلامی ادب کے محاذ کا ایک سرگرم مجاہد ہے۔ اس کے لکھنے والے بالعموم وہ اہل قلم ہیں جن کا تعلق حلقۂ ادب اسلامی یا انجمن تعمیر پسند مصنفین کے طرزِ فکر سے ہے۔ نظم و نثر دونوں میدانوں میں یہ جریدہ نئے نئے اسالیب کے ساتھ اسلامی قدروں کو پیش کر رہا ہے۔ اہتمام صرف اسی کا نہیں کہ جریدے کا معنوی پہلو معیار سے نہ گرنے پائے بلکہ ظاہری محاسن کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مرتب رسالہ کو معیار کے ساتھ ساتھ تنوع کی اہمیت کا جو احساس ہے اس کا ثبوت "یثرب" کے ہر شمارے سے مل سکتا ہے۔

ماہنامہ "فردوس"	زیر ادارت :- محمد جلیل خاں صاحب مقام اشاعت :- قائم گنج ضلع فرخ آباد، یوپی (انڈیا)

چندہ سالانہ :- چار روپے فی پرچہ ۵ ر

یہ رسالہ بھی بکھرے ہوئے اسلامی طرزِ فکر کا ایک اچھا مظہر ہے۔ زبان کی سادگی اور اندازِ بیان کے عام فہم ہونے کا جو لحاظ رکھا گیا ہے اس کی وجہ سے یہ عورتوں، بچوں اور کم خواندہ لوگوں کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو سکتا ہے "الحسنات" رام پور کے بعد یہ رسالہ اس قابل ہے کہ مسلمان گھرانے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں اور اپنی خواتین اور بچوں کے فکر و اخلاق کی تعمیر اسلامی بنیادوں پر کرنے کے لئے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ الحسنات کی طرح فردوس کی یہ اہمیت بھی نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ اس رسالے کے مندرجات سے "تعلیمِ بالغاں" کے کام میں مدد لی جا سکتی ہے۔ فردوس کا صوری معیار بھی پست نہیں ہے۔

ماہنامہ "تجلیاں"

بہ ادارت :- قطب الدین احمد صاحب
مقام اشاعت :- چھتہ بازار، حیدرآباد، دکن (انڈیا)
چندہ سالانہ :- تین روپے آٹھ آنے (فی پرچہ ۵/)

یہ اگرچہ ماہنامہ ہے لیکن اسے "بچوں کا اخبار" قرار دیا گیا ہے۔ اس میں بچوں کے لئے معلومات بڑھانے اور مفید قسم کی تفریحات فراہم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کوئی ایسا پہلو اس رسالے میں ہمارے سامنے نہیں آیا جو اسے بچوں کے دوسرے رسالوں سے خاص طور پر ممتاز کرنے والا ہو۔

تین پمفلٹ

(۱) خلافت اسلامی کے چار بنیادی مقاصد - از عبدالرحیم اشرف صاحب قیمت ۴ر
(۲) اسلامی معاشرہ کی خصوصیات - از محمد نذیر صاحب مسلم قیمت ۳ر
(۳) تہذیب کا نیا دن - از نعیم صدیقی قیمت ار

یہ پمفلٹ مکتبۂ تہذیبِ ملت (امین پور بازار، لائل پور) نے شائع کئے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر وہ کا نفسِ مضمون قراردادِ مقاصد کی روشنی میں ان تبدیلیوں کا تصور دلاتا ہے جو اب پاکستان کے نظامِ حکومت اور اس کی سوسائٹی میں رونما ہونی چاہئیں اور جن کے رونما ہونے ہی کا نام اسلامی نظام کا قیام ہے۔ استدلال کتاب و سنت سے کیا گیا ہے۔ تیسرے پمفلٹ میں کافرانہ نظام زندگی کو رات قرار دے کر اس اضطراب کا اظہار کیا گیا ہے جو ایسے نظام کے تحت ایک مسلم کے دل میں پیدا ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے افق سے نظام اسلامی کی صبح کے ظہور کا مژدہ سنایا گیا ہے، جس سے دلوں کے ولولے متحرک ہو سکتے ہیں۔

"ناظرین ترجمان القرآن"

کے لئے

خوش خبری

"ترجمان القرآن" کے تمام ناظرین یہ خبر سن کر بہت خوش ہونگے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے ملتان جیل سے "تفہیم القرآن" کو نظر ثانی کے بعد مرتب کرکے بھیج دیا ہے۔ یہ کتاب فی الحال دو جلدوں میں ہوگی۔ پہلی جلد سورۃ الفاتحہ سے سورۃ المائدہ تک مع دیباچہ اور مقدمہ کے ہوگی اور دوسری جلد سورۃ الانعام سے سورۃ یوسف تک۔ تفہیم القرآن کا مسودہ شیخ قمر الدین صاحب، پبلشر، اندرون موچی دروازہ لاہور کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ جو اسے دیدہ زیب بنا کر شائع کریں گے۔

اس کے علاوہ مولانا محترم نے اپنی کتاب "سود" کو مکمل کرنے کے لئے کچھ مضامین ارسال فرمائے ہیں۔ جو انشاء اللہ ترجمان القرآن کی اگلی اشاعت سے شائع کرنے شروع کر دئے جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ "سود" میں بھی شامل کئے جائیں گے۔

مینیجر

ترجمان القرآن

۵ - اے - ذیلدار پارک - اچھرہ

لاہور

سرورق مطبوعہ رہبر پریس، لاہور